جلد ۷۹ اپریل ۱۹۷۳ء عدد ۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۹ | اپریل ۱۹۷۳ء مطابق ربیع الاول ۱۳۹۳ھ | عدد ۲

ماہنامہ ترجمان القرآن

۵-اے ذیلدار پارک - اچھرہ لاہور

چندہ سالانہ: دس روپیہ ——— فی پرچہ: ایک روپیہ

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا - پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان القرآن کے قارئین اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ ہیں کہ ہم نے اپنے قلم سے کبھی سنسنی پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ نہایت سنگین قسم کے حالات میں بھی قوم کو مایوسی اور قنوطیت کا شکار ہونے سے بچایا ہے اور اسے شعاع امید دکھانے کی سعی کی ہے۔ مگر ہم اسے دیانت کے خلاف سمجھتے ہیں کہ اہل وطن سے ملک کی صحیح صورت حال کو چھپایا جائے اور اب جب کہ ملک انتہائی نازک اور پریشان کن مراحل سے گزر رہا ہے تو انہیں اس خوش فہمی میں مبتلا رکھا جائے کہ پاکستان بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔ اس قسم کی خوش فہمی پیدا کرنا قوم کی کوئی خدمت نہیں بلکہ اس کے ساتھ شرمناک قسم کی دھوکہ بازی ہے۔ جب گھر کے اندر اور باہر آگ لگی ہو اور گھر کے مکینوں کی بیشتر تعداد اس سے غافل ہو تو جو لوگ اس تباہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں ان کا جہاں یہ فرض ہے کہ وہ اپنی حد تک آگ بجھانے کی کوشش کریں وہاں ان پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ بے خبر اور نیند کے ماتے انسانوں کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کریں تاکہ وہ کہیں خواب غفلت میں نہ مارے جائیں اور اگر وہ اس آگ پر قابو پانے کے لیے کچھ کرنے کی طاقت رکھتے ہوں تو کر گزریں۔ اسی احساس کے تحت ہم یہ سطور لکھ رہے ہیں۔

ہم اپنے اہل وطن کو یہ تلخ حقیقت بلا کم و کاست بتا دینا چاہتے ہیں کہ جو ملکی اور غیر ملکی طاقتیں مشرقی پاکستان کی بربادی کا باعث بنی ہیں وہی طاقتیں آج مغربی پاکستان کو تباہ کرنے میں پوری طرح منہمک اور سرگرم عمل ہیں اور ان کے انہماک اور سرگرمیوں کے نتائج سے کوئی ایسا شخص غافل نہیں جو حالات کی معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے۔ تباہی کا عمل ہر میدان میں شروع ہو چکا ہے اور اگر اسے غیر معمولی تدبر، حکمت و دانائی، اخلاص اور قوت سے نہ روکا گیا تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کہیں ملک کے اس حصے کا

بھی وہی حشر نہ ہو جو مشرقی پاکستان کا ہوا ہے۔ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ مگر حالات جس رخ جا رہے ہیں، انہیں دیکھتے ہوئے انسان دہشت زدہ ضرور ہو جاتا ہے۔

جس طرح کسی شخص کے بیمار ہونے سے پہلے ہی اس کے جسم پر بیماری کی علامتیں نمودار ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور مرض کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ان علامتوں میں بھی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے بالکل اسی طرح قوموں کی زندگی میں بھی بعض علامتیں ایسی ابھرتی ہیں جو ان کی صحت کا پتہ دیتی ہیں اور بعض علامتوں سے ان کے تنزل اور بربادی کا نشان ملتا ہے۔ کسی قوم کے لیے خطرے کا سب سے بڑا الارم یہ ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقصد وجود کی بھی خبر نہ رہے اور اس کے ذمہ دار افراد دیوانوں کی طرح اپنی زبان سے اناپ شناپ کہتے رہیں۔ اور قوم کو کسی تعمیری اور با مقصد کام پر لگانے کے بجائے اسے میلوں ٹھیلوں میں مصروف رکھیں، اور اگر اس سے کوئی کام بھی لیں تو وہ سراسر تخریبی نوعیت کا ہو۔ جب کوئی فرد اپنی زندگی کا مقصد کھو دیتا ہے تو اس کا وجود کارزارِ حیات میں بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور اس کی زندگی اور حیوان کی زندگی میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اس بے مقصد انسان کی زندگی گو انسانی نقطۂ نظر سے عبث اور بیکار ہوتی ہے مگر اس کا چراغِ حیات گل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اس دنیا سے اسی وقت رخصت ہوتا ہے جب قدرت کی طرف سے اس کے سانس پورے ہو چکے ہوں۔ وہ خواہ دیوانوں کی طرح زندہ رہے یا حیوانوں کی طرح لیکن ایک معینہ مدت تک زندہ ضرور رہتا ہے۔ قوموں کی زندگی کا معاملہ افراد کی زندگی سے بہرحال بالکل مختلف ہوتا ہے۔ قوموں کی زندگی مقصد کی محبت سے عبارت ہوتی ہے۔ مقصد کی لگن ہی کسی قوم کی حیات ہے اور مقصد سے بُعد اور دوری موت۔ جب تک کوئی قوم کسی مقصد کی محبت میں سرشار رہتی ہے اور اس کی خاطر وہ ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہوتی ہے اس وقت تک اس کی زندگی کو نہ صرف یہ کہ کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا بلکہ وہ قوت اور طاقت اور عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔ اس کی صفوں میں کامل اتحاد اور اس کے افراد میں اپنی صلاحیتوں کو تعمیر و ترقی کی راہ پر لگانے کا شدید جذبہ کارفرما رہتا ہے۔

با مقصد قوم جو قدم بھی اٹھاتی ہے سوچ سمجھ کر اٹھاتی ہے اور جو کچھ بھی کرتی ہے پورے اعتماد اور اِس احساس ذمہ داری کے ساتھ کرتی ہے کہ اس کا یہ عمل اسے اپنے مقصد کے قریب تر لا رہا ہے۔

اُس کے لیے اس بات کا تصور بھی ممکن نہیں ہوتا کہ وہ اپنی قوتوں اور اوقات کو ایسے فضول کاموں میں صرف کرے جن سے اس کی منزل کھوٹی ہونے کا کوئی معمولی خطرہ بھی ہو۔ مقصد کا عشق نہ صرف اس کے اندر ترتیب و تنظیم پیدا کرتا ہے بلکہ اسے راستے کی دشواریوں سے بے نیاز کر کے رواں دواں منزلِ مقصود کی طرف لے جاتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اس بنیادی اصول کی روشنی میں جب ہم اپنی قوم کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا ہے کہ ہماری قوم کا نصب العین سے رشتہ اتنا کمزور پڑتا جا رہا ہے جتنا کہ کسی دم اکھڑتے مریض کا سانس سے ہوتا ہے۔ اسلامی نظام حیات کے احیاء کے بلند نصب العین نے اِس قوم کو ناقابل بیان مصائب اور شدائد کے باوجود زندہ رکھا، اُسے ہر عہد میں تازہ ولولہ بخشا، اس کے اندر باطل قوتوں سے ٹکرانے کی ہمت پیدا کی۔ آپ اس نیم برّاعظم کی گزشتہ ہزار سالہ تاریخ پر نگاہ ڈالیں تو آپ کو یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ مسلم قوم کی زندگی اور اس کے حفظ و بقا کا سارا دارومدار اسلام اور صرف اسلام پر رہا ہے۔ اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا سہارا ایسا نظر نہیں آتا جس سے اُس نے ماضی میں قوت و توانائی حاصل کی ہو یا آئندہ حاصل کرنے کا بعید امکان بھی ہو۔ مسلمانوں نے اس نیم برّاعظم میں مختلف میدانوں میں جو جدوجہد کی ہے اس کے پس پردہ بھی یہی ایک جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ ان کی اجتماعی زندگی اس مثالی نقشے کے مطابق مرتب ہونی چاہیے جو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جلیل القدر صحابہ سے ملا ہے۔ یہی جذبہ مسلمانوں کی ساری قومی تحریکوں میں خواہ وہ شاہ اسماعیل شہید کی تحریک آزادی ہو یا تحریک خلافت صاف جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اور تو اور خود تحریک پاکستان بھی اسی جذبے کا عملی اظہار ہے۔ اور اسی وجہ سے اس تحریک میں اُن مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جو اس حقیقت سے پوری طرح واقف تھے کہ انہیں پاکستان کے اندر رہنے کا کبھی موقع نہ ملے گا اور پاکستان کے مادی وسائل سے وہ قطعاً کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

قومیں بلاشبہ اپنے نظریات اور مقاصد تبدیل کرتی رہتی ہیں مگر اس تبدیلی کی ٹھوس وجوہ ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک قوم پہلے ایک نظریے کی علمبردار بن کر جدوجہد کرتی ہے مگر جب اُس نظریے کے عملی

نتائج سامنے آتے ہیں اور اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ یہی نظریہ اُس کی تباہی کا موجب بنا ہے تو وہ فوراً اس نظریے سے تائب ہو کر کوئی دوسرا نظریہ اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کی مثال ہمیں نازیوں کے دلپسند آریائی نسلی تفوق کے نظریے میں ملتی ہے۔ پہلے تو اہل جرمن نے اس نظریے کو پورے جوش وخروش سے اپنایا مگر جب اس نظریے کی تباہ کاریاں اُن کے سامنے آئیں تو پھر اس کے بارے میں اُن کے اندر سرد مہری کے احساسات پیدا ہوئے اور انھوں نے اُسے ترک کر دینے ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

کسی نظریے کو تیاگ دینے کی دوسری وجہ عام طور پر یہ ہوتی ہے کہ وہ نظریۂ حیات قوم کے بہت سے فکری اور عملی مسائل کو حل کرنے کی صلاحیت سے عاری ہوتا ہے اور قوم کے اندر یہ احساس اُبھرنے لگتا ہے کہ یہ اُس کے لیے پیر تسمہ پا بنا ہوا ہے اس لیے جب تک اس سے نجات حاصل نہیں کی جاتی وہ دنیا میں کوئی قابل قدر ترقی نہیں کر سکتی۔ اس کی مثال ہمیں اہل مغرب اور مسیحیت کے باہمی تعلق سے ملتی ہے۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد جب دنیائے مغرب کے اندر ذہنی اور فکری بیداری پیدا ہوئی تو مسیحی تعلیمات کا ناقدانہ جائزہ لیا جانے لگا اور اس حقیقت کا کھوج لگانے کی کوششیں شروع ہوئیں کہ یہ مذہب اہل مغرب کے نئے تقاضوں کو کہاں تک بطریق احسن پورا کر سکتا ہے۔ اس جائزے کے بعد جب یہ بات کھل کر سامنے آئی کہ مسیحیت اجتماعی معاملات میں انسان کی رہنمائی نہیں کر سکتی، تو اس مذہب کو زندگی کے شخصی دائرے تک محدود کر دیا گیا اور اجتماعی معاملات کو مذہب کے اثر سے یکسر آزاد رہ کر حل کرنے کے منصوبے بنائے جانے لگے۔

کسی نظریے کو ترک کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ نظریہ ایسی خرافات اور مضحکہ خیز تعلیمات سے عبارت ہوتا ہے کہ کوئی قوم اُسے دیر تک اپنے سینے سے لگائے رہنے کی ہمت اور جرأت نہیں کرتی۔ پھر ان خرافات کی وجہ سے اس قوم کی تاریخ اتنی سیاہ ہوتی ہے کہ نئی نسلیں اپنے ماضی پر فخر کرنے کے بجائے شرم محسوس کرتی ہیں۔ اُن کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ کسی طرح اُن کا اس تاریک ماضی سے رشتہ منقطع ہو جائے۔ اس لیے وہ نہ صرف ماضی سے اپنے تعلق کو ختم کر دیتی ہیں بلکہ تاریک خیالی کے اس نظریے سے بھی دامن کش ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے اُن کا ماضی سیاہ ہوا ہے۔

ان تینوں وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ بھی ایسی نہیں جو مسلم قوم کے لیے ترکِ اسلام کی ترغیب کا باعث بن سکے۔ اسلام ایک ایسا مکمل متوازن اور ہمہ گیر نظریہ حیات ہے جس کے صحیح اور برحق ہونے پر پوری انسانی تاریخ شہادت پیش کرتی ہے۔ پھر یہ کوئی ایسا نظریہ نہیں جو صرف کتابوں کے صفحات کی زینت ہو بلکہ اس نے زندگی کے ہر دائرے میں ایسے تابناک نقوش چھوڑے ہیں جن کی روشنی سے آج بھی انسانیت ہر گام پر ہدایت اور رہنمائی حاصل کر رہی ہے۔ انسانیت دینِ فطرت سے جس قدر انحراف کرتی ہے اسی قدر تھپیڑے کھا کر دوبارہ اس کی طرف لوٹنے پر مجبور ہوتی ہے۔ ہم یہاں اس کی دو مثالیں پیش کرتے ہیں۔ اسلام نے انسان کی اصلاح کا جو پروگرام پیش کیا ہے اس کا ایک نہایت اہم جزو یہ ہے کہ سب سے پہلے انسان کے اندر جو انسان چھپا بیٹھا ہے اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے کیونکہ جب تک وہ داخلی طور پر اپنے آپ کو کسی ضابطے کا پابند نہیں کرتا ملکی اور معاشرتی قوانین یا دوسرے لفظوں میں خارجی جکڑ بندیاں انسان کو کسی ضابطہ اخلاق کا پابند نہیں بنا سکتیں۔ دنیائے مغرب نے اس نظریے کو دقیانوسی قرار دیتے ہوئے رد کر دیا اور اپنے اس طرزِ عمل کے حق میں یہ دلیل پیش کی کہ اصلاحِ باطن کا دار و مدار جن احساسات پر ہے یعنی خوفِ خدا اور فکرِ آخرت وہ انسان کے فکری نشو و نما میں حارج ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل و دماغ کو اس قسم کے غیر صحت مندانہ احساسات سے پاک کیا جائے اور اسے صرف جبلی محرکات اور تلخ و شیریں تجربات کی روشنی میں پروان چڑھنے دیا جائے۔ اس نظریے کا خوب پرچار کیا گیا اور اہلِ یورپ نے اپنی نوخیز نسلوں کو خدا، آخرت، ضمیر، ایمان جیسے تصورات سے پوری طرح بچا کر پرورش کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کا نیا انسان بپھرے ہوئے حیوان کی صورت میں سامنے آیا اور مغرب کی انسانی برادری کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اس انسان نما حیوان کو نظم و ضبط کا پابند بنانے کے لیے نہایت سخت قسم کے ضابطے وضع کرے۔ یہ فکری آزادی کی اس تحریک کا ثمرہ تھا جس نے اہلِ یورپ کو فاشزم، نازی ازم اور اشتمالیت جیسے غیر انسانی نظاموں کو بالجبر اپنے اوپر مسلط کرنے پر مجبور کر دیا۔ یورپ میں اس موضوع پر جو لٹریچر شائع ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ یورپ کو اپنی اس غلطی کا شدید احساس ہوا ہے۔ غالباً گزشتہ برس ریڈرز ڈائجسٹ میں امریکہ کے سابق صدر آئزن ہاور کا اس موضوع پر ایک فکر انگیز مقالہ شائع ہوا جس میں اس غلطی کا واضح اعتراف موجود تھا۔

قریب قریب یہی حال اہل مغرب کے معاشی تجربات کا ہے۔ وہ کبھی آزاد معیشت کی پالیسی اختیار کرتے ہیں اور جب اس کی برائیاں کھل کر سامنے آتی ہیں تو ان کے تدارک کے لیے معاشی جکڑ بندیوں کا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد جب اس کی ہولناکیوں کا پتہ چلتا ہے تو پھر آزاد معیشت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بدنصیبی کے یہ چکر اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مغرب جس نظام حیات کا علمبردار ہے وہ توازن سے یکسر عاری ہے۔

مسلم قوم اگرچہ اس وقت ذہنی اور عملی انحطاط کا شکار ہے مگر اس انحطاط کے باوجود وہ فکری لحاظ سے اس قدر تہی دامن نہیں ہوئی کہ اسلامی نظام حیات کی غیر معمولی خوبیوں اور باطل نظاموں کی نمایاں خامیوں کو نہ سمجھ سکے خصوصاً جبکہ تجربات کی کسوٹی نے کھرے اور کھوٹے سکوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلامی نظام میں جو توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے اسے ہر مسلمان نہ صرف اچھی طرح جانتا ہے بلکہ اسے پوری طرح محسوس بھی کرتا ہے اور اسلام کے اس امتیازی وصف کے عملی مضمرات سے بھی وہ بخوبی واقف ہے۔

اس کے علاوہ ہر مسلمان اس حقیقت سے بھی پوری طرح آشنا ہے کہ اسلام خالق کائنات کا عطا کردہ نظام حیات ہونے کی وجہ سے ہر دور میں اور ہر قسم کے حالات میں انسان کی صحیح رہنمائی کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ کبھی کہنہ اور از کار رفتہ نہیں ہوتا بلکہ ہر دور کے تقاضوں کو نہایت اچھے انداز میں پورا کر سکتا ہے۔ اس کے افکار و نظریات، اس کے اساسی تصورات، اس کے اخلاقی اور معاشرتی ضابطے اور معاشی اور سیاسی ڈھانچے سب اس کی تر و تازگی کی شہادت پیش کرتے ہیں۔

پھر اسلام کا ماضی اس قدر درخشاں اور تابناک ہے کہ مسلمانوں نے اسے دیکھ کر ہمیشہ فخر سے سر اونچا کیا ہے۔ وہ جب بھی اپنے ماضی پر نگاہ ڈالتے ہیں انہیں کبھی بھی ندامت محسوس نہیں ہوئی بلکہ انہیں ہمیشہ اس امر کا احساس ہوا ہے کہ اُن کے دین نے انسانوں کو انسانیت سکھائی، تہذیب کے گیسو سنوارے، علم و فن کو بام عروج تک پہنچایا اور عقل کو چار چاند لگائے۔ دنیا میں آج علم و ہنر کی جو روشنی موجود ہے وہ سب مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

اسلام کے بارے میں مسلمانوں کے ان احساسات اور جذبات کے ہوتے ہوئے کیا اس بات کا تصور

بھی کیا جا سکتا ہے کہ وہ دین حق کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو اختیار کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں خصوصاً جب انہیں اس بات کا بھی پوری طرح شعور ہو کہ اسلام اُن کے لیے رگِ جاں کی حیثیت رکھتا ہے۔

اسلام کے ساتھ مسلمانوں کے اس گہرے تعلق کے پس منظر میں جب ہم پاکستان میں غیر اسلامی نظریات کی یلغار اور اس معاملے میں اہل پاکستان کے کمزور دفاعی موقف اور خطرے کے صحیح احساس میں کمی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم پر سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے کیونکہ یہ علامتیں اس بات کی دہائی دے رہی ہیں کہ یہ ملک کسی تباہ کن طوفان کی لپیٹ میں آنے والا ہے جس کی مدافعت کے لیے نہ تو ہمارے پاس کوئی ساز و سامان ہے نہ اس کی روک تھام کے لیے ہم نے کوئی موثر تیاری کر رکھی ہے اور نہ اس کی شدت کو ہماری قوم نے پوری طرح بھانپا ہے۔ طوفان کا آغاز ہمیشہ ہوا کے نرم جھونکوں اور خس و خاشاک کے اُڑنے سے ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ اس میں تندی پیدا ہونی شروع ہوتی ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ پاکستان کس وقت سے اس طوفان کی زد میں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ پاکستان کے قیام سے پہلے جب محض اس کا تصور ہی ابھرا تھا تو اسلام دشمن طاقتیں اس کے خلاف طوفان اٹھانے کی تیاری میں مصروف ہو گئی تھیں کیونکہ مذہب کی بنیاد پر کسی الگ خطہ ارض کا قیام ان کے تصور قومیت کے لیے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ پہلے تو وہ اس کے قیام میں حائل ہوئیں اور جب اُن کی ساری کوششوں کے علی الرغم یہ معرض وجود میں آ گیا تو پھر اس کے خلاف خوفناک قسم کی سازشیں شروع کر دیں۔ ان سازشوں میں بعض سازشیں تو بڑی کھلی اور واضح تھیں اور بعض پس پردہ مگر ان سب کا مقصد ایک ہی رہا ہے کہ کسی طرح اِس خطۂ پاک کو دنیا کے نقشے سے مٹا دیا جائے جو اسلام کے تصور قومیت کے نشان کی حیثیت سے ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹک رہا ہے۔ اسلام دشمن طاقتوں کی سرگرمیاں یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں دیکھی جا سکتی ہیں مگر بعض شعبوں میں یہ بڑی نمایاں ہیں۔ مثلاً سیاست میں ان کے ذریعے مسلم قوم کے دل و دماغ میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ یہ ملک کسی ایک قوم کا ملک نہیں بلکہ پانچ مختلف قومیتوں کا ملک ہے۔ بنگالی، پنجابی، بلوچی، سندھی اور پٹھان اِس باطل خیال کو تقویت دینے کے لیے کبھی علاقائی زبانوں کی ترقی پر زور دیا جاتا اور کبھی علاقائی ثقافت کی ترویج و اشاعت کی اہمیت جتلائی جاتی ان ساری کارروائیوں کا ہدف بہر حال ایک ہی تھا کہ مذہب نے اس ملک کے باشندوں کے مابین اخوت کا جو رشتہ قائم کر کے (باقی صفحہ ۷۴ پر)

تفہیمُ القرآن

مُعَوِّذَتَین

(۲)

اسلام میں جھاڑ پھونک کی حیثیت | تیسرا مسئلہ اِن سورتوں کے معاملہ میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا جھاڑ پھونک کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے؟ اور یہ کہ جھاڑ پھونک بجائے خود مؤثر بھی ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ بکثرت صحیح احادیث میں یہ ذکر آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات کو سوتے وقت، اور خاص طور پر بیماری کی حالت میں مُعوِّذَتَین، یا بعض روایات کے مطابق مُعوِّذات (یعنی قل ھو اللہ اور مُعوِّذَتَین) تین مرتبہ پڑھ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پھونکتے اور سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم پر، جہاں جہاں تک بھی آپ کے ہاتھ پہنچ سکتے، انہیں پھیرتے تھے۔ آخری بیماری میں جب آپ کے لیے خود ایسا کرنا ممکن نہ رہا تو حضرت عائشہؓ نے یہ سورتیں (بطورِ خود یا حضور کے حکم سے) پڑھیں اور آپ کے دستِ مبارک کی برکت کے خیال سے آپ ہی کے ہاتھ لے کر آپ کے جسم پر پھیرے۔ اس مضمون کی روایات صحیح سندوں کے ساتھ بخاری، مسلم، نسائی، ابن ماجہ، ابوداؤد اور مُوَطّا امام مالک میں خود حضرت عائشہؓ سے مروی ہیں جن سے بڑھ کر کوئی بھی حضورؐ کی خانگی زندگی سے واقف نہ ہو سکتا تھا۔

اس معاملہ میں پہلے مسئلہ شرعی اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ احادیث میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طویل روایت آئی ہے جس کے آخر میں حضورؐ فرماتے ہیں کہ میری امت کے وہ لوگ بلاحساب جنت میں داخل ہوں گے جو نہ داغنے کا علاج کراتے ہیں، نہ جھاڑ پھونک کراتے ہیں، نہ فال لیتے ہیں بلکہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں (مسلم)۔ حضرت مُغیرہؓ بن شعبہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا جس نے داغنے سے علاج کرایا اور جھاڑ پھونک کرائی وہ اللہ پر توکل سے بے تعلق ہو گیا (ترمذی)۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس چیزوں کو ناپسند فرماتے تھے جن میں سے ایک جھاڑ پھونک بھی ہے سوائے مُعوِّذَتین یا مُعوِّذات کے (ابوداؤد، احمد، نسائی، ابن حِبّان، حاکم)۔ بعض احادیث

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک سے بالکل منع فرما دیا تھا، لیکن بعد میں اس شرط کے ساتھ اس کی اجازت دے دی کہ اس میں شرک نہ ہو، اللہ کے پاک ناموں یا اس کے کلام سے جھاڑا جائے، کلام ایسا ہو جو سمجھ میں آئے اور یہ معلوم کیا جا سکے کہ اس میں کوئی گناہ کی چیز نہیں ہے، اور بھروسہ جھاڑ پھونک پر نہ کیا جائے کہ وہ بجائے خود شفا دینے والی ہے، بلکہ اللہ پر اعتماد کیا جائے کہ وہ چاہے گا تو اسے نافع بنا دے گا۔ یہ مسئلۂ شرعی واضح ہو جانے کے بعد اب دیکھیے کہ احادیث اس بارے میں کیا کہتی ہیں:

طَبَرانی نے صغیر میں حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضورؐ کو ایک دفعہ نماز کی حالت میں بچھو نے کاٹ لیا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا بچھو پر خدا کی لعنت، یہ نہ کسی نمازی کو چھوڑتا ہے نہ کسی اور کو۔ پھر پانی اور نمک منگوایا اور جہاں بچھو نے کاٹا تھا وہاں آپ نمکین پانی ملتے جاتے تھے اور قل یا ایہا الکافرون، قل ھو اللہ احد، قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھتے جاتے تھے۔

ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی احادیث میں آئی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ پر یہ دعا پڑھتے تھے اُعِیْذُکُمَا بِکَلِمَاتِ اللّٰہِ التَّآمَّۃِ مِنْ کُلِّ شَیْطَانٍ وَّھَامَّۃٍ وَّمِنْ کُلِّ عَیْنٍ لَّآمَّۃٍ "میں تم کو اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ میں دیتا ہوں ہر شیطان اور موذی سے اور ہر نظرِ بد سے" (بخاری، مسند احمد، ترمذی اور ابن ماجہ)۔

عثمان بنؓ ابی العاص الثقفی کے متعلق مسلم، مُوَطّا، طَبَرانی اور حاکم میں تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ یہ روایت آئی ہے کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ میں جب سے مسلمان ہوا ہوں مجھے ایک درد محسوس ہوتا ہے جو مجھ کو مارے ڈالتا ہے۔ آپ نے فرمایا اپنا سیدھا ہاتھ اُس جگہ پر رکھو جہاں درد ہوتا ہے، پھر تین مرتبہ بسم اللہ کہو اور سات مرتبہ یہ کہتے ہوئے ہاتھ پھیرو کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ وَقُدْرَتِہٖ مِنْ شَرِّ مَا اَجِدُ وَاُحَاذِرُ "میں اللہ اور اس کی قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس چیز کے شر سے جس کو میں محسوس کرتا ہوں اور جس کے لاحق ہونے کا مجھے خوف ہے"۔ مُوَطّا میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ عثمانؓ بن ابی العاص نے کہا کہ اس کے بعد میرا وہ درد جاتا رہا، اور اِسی چیز کی تعلیم میں اپنے گھر والوں کو دیتا ہوں۔

مُسند احمد اور طحاوی میں طلق بن علی کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں بچھو نے کاٹ لیا۔ حضورؐ نے مجھ پر پڑھ کر پھونکا اور اس جگہ پر ہاتھ پھیرا۔

مسلم میں ابو سعید خدری کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئے تو جبریل نے آکر پوچھا "اے محمدؐ، کیا آپ بیمار ہو گئے؟" آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے کہا بِسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ یُؤْذِیْکَ مِنْ شَرِّ کُلِّ نَفْسٍ اَوْ عَیْنٍ حَاسِدٍ، اَللّٰہُ یَشْفِیْکَ بِاسْمِ اللّٰہِ اَرْقِیْکَ "میں اللہ کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں ہر اس چیز سے جو آپ کو اذیت دے اور ہر نفس اور حاسد کی نظر کے شر سے، اللہ آپ کو شفا دے، میں اس کے نام پر آپ کو جھاڑتا ہوں" اسی سے ملتی جلتی روایت مُسند احمد میں حضرت عُبادہ بن صامت سے منقول ہے کہ حضورؐ بیمار تھے۔ میں عیادت کے لیے گیا تو آپ کو سخت تکلیف میں پایا۔ شام کو گیا تو آپ بالکل تندرست تھے۔ میں نے اس قدر جلدی تندرست ہو جانے کی وجہ پوچھی تو فرمایا کہ جبریلؑ آئے تھے اور انہوں نے مجھے چند کلمات سے جھاڑا۔ پھر آپ نے قریب قریب اُسی طرح کے الفاظ اُن کو سنائے جو اوپر والی حدیث میں نقل کیے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ سے بھی مسلم اور مُسند احمد میں ایسی ہی روایت نقل کی گئی ہے۔

امام احمد نے اپنی مُسند میں حضرت حفصہؓ ام المومنین کی روایت نقل کی ہے کہ ایک روز نبی صلی اللہ علیہ وسلم میرے ہاں آئے اور میرے پاس ایک خاتون شِفاؓ نامی بیٹھی تھیں جو نَملہ (ذُباب) کو جھاڑا کرتی تھیں۔ حضورؐ نے فرمایا حفصہؓ کو بھی وہ عمل سکھا دو۔ خود شفاؓ بنت عبداللہ کی یہ روایت امام احمد، ابو داؤد اور نسائی نے نقل کی ہے کہ حضورؐ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نے حفصہؓ کو جس طرح لکھنا پڑھنا سکھایا ہے نَملہ کا جھاڑنا بھی سکھا دو۔

مسلم میں عوف بن مالک اشجعی کی روایت ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں ہم لوگ جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ اس معاملہ میں حضورؐ کی رائے کیا ہے۔

سلہ ان خاتون کا اصل نام لیلیٰ تھا، مگر شفا بنت عبداللہ کے نام سے مشہور تھیں۔ ہجرت سے پہلے ایمان لائیں۔ قریش کے خاندان بنی عدی سے ان کا تعلق تھا۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے ایک فرد حضرت عمرؓ تھے۔ اس طرح یہ حضرت حفصہؓ کی رشتہ دار ہوتی تھیں۔

حضورؐ نے فرمایا جن چیزوں سے تم جھاڑتے تھے وہ میرے سامنے پیش کرو، جھاڑنے میں مضائقہ نہیں ہے جب تک اس میں شرک نہ ہو۔

مسلم، مُسند احمد، اور ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر حضرت عمرو بن حزمؓ کے خاندان کے لوگ آئے اور کہا کہ ہمارے پاس ایک عمل تھا جس سے ہم بچھو (یا سانپ) کاٹے کو جھاڑتے تھے۔ مگر آپ نے اس کام سے منع فرمادیا ہے۔ پھر انھوں نے وہ چیز آپ کو سنائی جو وہ پڑھتے تھے۔ آپ نے فرمایا "اِس میں تو کوئی مضائقہ میں نہیں پاتا، تم میں سے جو شخص اپنے کسی بھائی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے وہ ضرور پہنچائے"۔ جابر بن عبداللہؓ کی دوسری حدیث مسلم میں یہ ہے کہ آلِ حزم کے پاس سانپ کاٹے کا عمل تھا اور حضورؐ نے ان کو اس کی اجازت دے دی۔ اس کی تائید مسلم، مُسند احمد، اور ابن ماجہ میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت بھی کرتی ہے کہ حضورؐ نے انصار کے ایک خاندان کو ہر زہریلے جانور کے کاٹے کو جھاڑنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ مُسند احمد اور ترمذی اور مسلم اور ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے بھی اس سے ملتی جلتی روایات نقل کی گئی ہیں جن میں حضورؐ نے زہریلے جانوروں کے کاٹے، اور ذُباب کے مرض اور نظرِ بد کے جھاڑنے کی اجازت دی۔

مُسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ اور حاکم نے حضرت عُمیرؓ مولیٰ ابی اللحم سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں میرے پاس ایک عمل تھا جس سے میں جھاڑا کرتا تھا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے پیش کیا۔ آپ نے فرمایا فلاں فلاں چیزیں اس میں سے نکال دو، باقی سے تم جھاڑ سکتے ہو۔

مُوَطّاء میں ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہؓ کے گھر تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ بیمار ہیں اور ایک یہودیہ اُن کو جھاڑ رہی ہے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ کتاب اللہ پڑھ کر جھاڑ۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اہلِ کتاب اگر توراۃ یا انجیل کی آیات پڑھ کر جھاڑیں تب بھی یہ جائز ہے۔

رہا یہ سوال کہ آیا جھاڑ پھونک مفید بھی ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اور علاج سے نہ صرف یہ کہ کبھی منع نہیں فرمایا، بلکہ خود فرمایا کہ ہر مرض کی دوا اللہ

نے پیدا کی ہے اور تم لوگ دوا کیا کرو۔ حضورؐ نے خود لوگوں کو بعض امراض کے علاج بتائے ہیں، جیسا کہ احادیث میں کتاب الطب کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ لیکن دوا بھی اللہ ہی کے حکم اور اذن سے نافع ہوتی ہے، ورنہ اگر دوا اور طبی معالجہ ہر حال میں نافع ہوتا تو ہسپتالوں میں کوئی نہ مرتا۔ اب اگر دوا اور علاج کرنے کے ساتھ اللہ کے کلام اور اس کے اسمائے حسنیٰ سے بھی استفادہ کیا جائے یا ایسی جگہ جہاں کوئی طبی امداد میسر نہ ہو اللہ ہی کی طرف رجوع کر کے اس کے کلام اور اسماء و صفات سے استعانت کی جائے تو یہ مادہ پرستوں کے سوا کسی کی عقل کے بھی خلاف نہیں ہے[۵]۔ البتہ یہ صحیح نہیں ہے کہ دوا اور علاج کو، جہاں وہ میسر ہو، جان بوجھ کر چھوڑ دیا جائے، اور صرف جھاڑ پھونک سے کام لینے ہی پر اکتفا کیا جائے، اور کچھ لوگ عملیات اور تعویذوں کے مطب کھول کر بیٹھ جائیں اور اسی کو کمائی کا ذریعہ بنا لیں۔

اس معاملہ میں بہت سے لوگ حضرت ابو سعیدؓ خُدری کی اُس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو بخاری، مسلم، ترمذی، مُسند احمد، ابو داؤد اور ابن ماجہ میں منقول ہوئی ہے اور اس کی تائید بخاری میں ابن عباسؓ کی بھی ایک روایت کرتی ہے۔ اس میں یہ بیان ہوا ہے کہ حضورؐ نے ایک مہم پر اپنے چند اصحاب کو بھیجا جن میں حضرت ابو سعیدؓ خُدری بھی تھے۔ یہ حضرات راستہ میں عرب کے ایک قبیلے کی بستی پر جا کر ٹھہرے اور انھوں نے قبیلے والوں سے کہا کہ ہماری میزبانی کرو۔ انھوں نے

---

[۵] مادہ پرست دنیا کے بھی بہت سے ڈاکٹروں نے اعتراف کیا ہے کہ دعا اور رجوع الی اللہ مریضوں کی شفایابی میں بہت کارگر چیز ہے۔ اور اس کا خود مجھے ذاتی طور پر اپنی زندگی میں دو مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مجھے نظر بند کیا گیا تو چند روز بعد ایک پتھری میرے مثانے میں آکر اَڑ گئی اور ۱۶ گھنٹے تک پیشاب بند رہا۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ میں ظالموں سے علاج کی درخواست نہیں کرنا چاہتا، تو ہی میرا علاج فرما دے۔ چنانچہ وہ پتھری پیشاب کے راستے سے ہٹ گئی اور ۲۰ برس تک ہٹی رہی یہاں تک کہ ۱۹۶۸ء میں اس نے پھر تکلیف دی اور اس کو آپریشن کر کے نکالا گیا۔ دوسری مرتبہ جب ۱۹۵۳ء میں مجھے گرفتار کیا گیا تو میری دونوں پنڈلیاں کئی مہینے سے داد کی سخت تکلیف میں مبتلا تھیں اور کسی علاج سے آرام نہیں آرہا تھا۔ گرفتاری کے بعد میں نے اللہ تعالیٰ سے پھر وہی دعا کی جو ۱۹۴۸ء میں کی تھی اور کسی علاج اور دوا کے بغیر پنڈلیاں داد سے بالکل صاف ہو گئیں۔ آج تک پھر کبھی وہ بیماری مجھے نہیں ہوئی۔

انکار کر دیا۔ اتنے میں قبیلے کے سردار کو بچھو نے کاٹ لیا اور وہ لوگ اِن مسافروں کے پاس آئے اور کہا کہ تمہارے پاس کوئی دوا یا عمل ہے جس سے تم ہمارے سردار کا علاج کر دو؟ حضرت ابو سعید نے کہا ہے تو سہی، مگر چونکہ تم نے ہماری میزبانی سے انکار کیا ہے اس لیے جب تک تم کچھ دینا نہ کرو، ہم اس کا علاج نہیں کریں گے۔ انہوں نے بکریوں کا ایک ریوڑ (بعض روایات میں ہے ۳۰ بکریاں) دینے کا وعدہ کیا اور حضرت ابو سعید نے جا کر اس پر سورۂ فاتحہ پڑھنی شروع کی اور لُعاب دھن اس پر ملتے گئے[۵]۔ آخر کار بچھو کا اثر زائل ہو گیا اور قبیلے والوں نے جتنی بکریاں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ لا کر دے دیں۔ مگر ان حضرات نے آپس میں کہا اِن بکریوں سے کوئی فائدہ نہ اٹھاؤ جب تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ نہ لیا جائے۔ نہ معلوم اس کام پر اجر لینا جائز ہے یا نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ماجرا عرض کیا۔ حضورؐ نے ہنس کر فرمایا تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ یہ سورۃ جھاڑنے کے کام بھی آسکتی ہے؟ بکریاں لے لو اور ان میں میرا حصہ بھی لگاؤ۔

لیکن اِس حدیث سے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے مطب چلانے کا جواز نکالنے سے پہلے عرب کے اُن حالات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے جن میں حضرت ابو سعید خُدری نے یہ کام کیا تھا اور حضورؐ نے اسے نہ صرف جائز رکھا تھا، بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ میرا حصہ بھی لگاؤ، تاکہ اس کے جواز کے معاملہ میں اِن اصحاب کے دلوں میں کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ عرب کے حالات اُس زمانے میں بھی یہ تھے اور آج تک یہ ہیں کہ پچاس پچاس، سو سو، ڈیڑھ ڈیڑھ سو میل تک آدمی کو ایک بستی سے چل کر دوسری بستی نہیں ملتی۔ بستیاں بھی اُس وقت ایسی نہ تھیں جن میں ہوٹل، سرائے یا کھانے کی دکانیں موجود ہوں اور مسافر کئی کئی روز کی مسافت طے کر کے جب وہاں پہنچے تو سامانِ خورد و نوش خرید سکے۔ اِن حالات میں یہ بات عرب کے معروف اصولِ اخلاق میں شامل تھی کہ مسافر جب کسی بستی پہ پہنچیں تو بستی کے لوگ ان کی میزبانی کریں۔ اِس سے انکار کے معنی بسا اوقات مسافروں کے لیے موت کے

[۵] اکثر روایات میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ عمل کرنے والے حضرت ابو سعید تھے۔ بلکہ ان میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ حضرت ابو سعید خود اس مہم میں شریک تھے۔ لیکن ترمذی کی روایت میں دونوں باتوں کی صراحت ہے۔

ہوتے تھے، اور عرب میں اس طرزِ عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کے اس فعل کو جائز رکھا کہ جب قبیلے والوں نے میزبانی سے انکار کر دیا تھا توان کے سردار کا علاج کرنے سے بھی انھوں نے انکار کر دیا، اور اس شرط پر اس کا علاج کرنے پر راضی ہوئے کہ وہ ان کو کچھ دینا کریں۔ پھر جب ان میں سے ایک صاحب نے اللہ کے بھروسے پر سورۂ فاتحہ اس سردار پر پڑھی اور وہ اس سے اچھا ہو گیا تو طے شدہ اجرت قبیلے والوں نے لا کر دے دی اور حضورؐ نے اس اجرت کے لینے کو حلال وطیب قرار دیا۔ بخاری میں اس واقعہ کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جو روایت ہے اس میں حضورؐ کے الفاظ یہ ہیں کہ ان احق ما اخذ تم علیہ اجرًا کتاب اللہ، یعنی بجائے اس کے کہ تم کوئی اور عمل کرتے، تمہارے لیے یہ زیادہ برحق بات تھی کہ تم نے اللہ کی کتاب پڑھ کر اس پر اجرت لی۔ یہ آپ نے اس لیے فرمایا کہ دوسرے تمام عملیات سے اللہ کا کلام بڑھ کر ہے، علاوہ بریں اس طرح عرب کے اُس قبیلے پر حقِ تبلیغ بھی ادا ہو گیا کہ انہیں اس کلام کی برکت معلوم ہو گئی جو اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں۔ اِس واقعہ کو اُن لوگوں کے لیے نظیر قرار نہیں دیا جا سکتا جو شہروں اور قصبوں میں بیٹھ کر جھاڑ پھونک کے مطب چلاتے ہیں اور اسی کو انھوں نے وسیلۂ معاش بنا رکھا ہے۔ اِس کی کوئی نظیر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین اور ائمہ سلف کے ہاں نہیں ملتی۔

سورۂ فاتحہ اور ان سورتوں کی مناسبت آخری چیز جو معوذتین کے بارے میں قابل توجہ ہے وہ قرآن کے آغاز اور اختتام کی مناسبت ہے۔ اگرچہ قرآن مجید ترتیبِ نزول پر مرتب نہیں کیا گیا ہے، مگر ۲۳ سال کے دوران میں مختلف حالات اور مواقع اور ضروریات کے لحاظ سے نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطورِ خود نہیں بلکہ اُن کے نازل کرنے والے خدا کے حکم سے اُس شکل میں مرتب فرمایا جس میں ہم اب اس کو پاتے ہیں۔ اِس ترتیب کے لحاظ سے قرآن کا آغاز سورۂ فاتحہ سے ہوتا ہے اور اختتام معوذتین پر۔ اب ذرا دونوں پر ایک نگاہ ڈالیے۔ آغاز میں اللہ رب العالمین، رحمان ورحیم، اور مالک یوم الدین کی حمد وثنا کر کے بندہ عرض کرتا ہے کہ آپ ہی کی میں بندگی کرتا ہوں اور آپ

ہی سے مدد چاہتا ہوں، اور سب سے بڑی مدد جو مجھے درکار ہے وہ یہ ہے کہ مجھے سیدھا راستہ بتائیے۔ جواب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدھا راستہ دکھانے کے لیے اُسے پورا قرآن دیا جاتا ہے، اور اس کو ختم اس بات پر کیا جاتا ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے جو ربُّ الفلق، ربُّ الناس، مَلِکُ الناس اور اِلٰہُ الناس ہے، عرض کرتا ہے کہ میں ہر مخلوق کے ہر فتنے اور شر سے محفوظ رہنے کے لیے آپ ہی کی پناہ لیتا ہوں، اور خصوصیت کے ساتھ شیاطینِ جن وانس کے وسوسوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، کیونکہ راہِ راست کی پیروی میں وہی سب سے زیادہ مانع ہوتے ہیں۔ اُس آغاز کے ساتھ یہ اختتام جو مناسبت رکھتا ہے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

الفلق

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے

کہو[۱]، میں پناہ مانگتا ہوں[۲] صبح کے رب کی[۳]، ہر اُس چیز کے شر سے جو اس نے پیدا کی ہے[۴]، اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے[۵]، اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے[۶]، اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے[۷]۔

[۱] چونکہ قُل (کہو) کا لفظ اُس پیغام کا ایک حصہ ہے جو تبلیغ رسالت کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعۂ وحی نازل ہوا ہے، اس لیے اگرچہ اس ارشاد کے اولین مخاطب تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر آپ کے بعد ہر مومن بھی اس کا مخاطب ہے۔

[۲] پناہ مانگنے کے فعل میں لازماً تین اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ ایک بجائے خود پناہ مانگنا۔ دوسرے پناہ مانگنے والا۔ تیسرا وہ جس کی پناہ مانگی جائے۔ پناہ مانگنے سے مراد کسی چیز سے خوف محسوس کر کے اپنے آپ کو اُس سے بچانے کے لیے کسی دوسرے کی حفاظت میں جانا، یا اس کی آڑ لینا، یا اُس سے لپٹ جانا یا اُس کے سایہ میں چلا جانا ہے۔ پناہ مانگنے والا بہرحال وہی شخص ہوتا ہے جو محسوس کرتا ہے کہ جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے اس کا مقابلہ وہ خود نہیں کر سکے گا بلکہ وہ اِس کا حاجت مند ہے کہ اُس سے بچنے کے لیے دوسرے کی پناہ لے۔ پھر جس کی پناہ مانگی جاتی ہے وہ لازماً کوئی ایسا ہی شخص یا وجود ہوتا ہے جس کے متعلق پناہ لینے والا یہ سمجھتا ہے کہ اُس خوفناک چیز سے وہی اس کو بچا سکتا ہے۔ اب پناہ کی ایک قسم تو وہ ہے جو قوانینِ طبعی کے مطابق عالمِ اسباب کے اندر کسی محسوس مادی چیز یا شخص یا طاقت سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً دشمن کے حملہ سے بچنے کے لیے کسی قلعہ میں پناہ لینا، یا گولیوں کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے خندق یا کسی دمدمے یا کسی دیوار کی آڑ لینا، یا کسی طاقت ور ظالم سے بچنے کے لیے کسی انسان یا قوم یا حکومت کے پاس پناہ لینا، یا دھوپ سے بچنے کے لیے کسی درخت یا عمارت کے سایہ میں پناہ لینا۔ بخلاف اس کے دوسری قسم وہ ہے جس میں ہر طرح کے خطرات اور ہر طرح کی مادی، اخلاقی یا روحانی مضرتوں اور نقصان رساں چیزوں سے کسی فوق الفطری ہستی کی پناہ اِس عقیدے کی بنا پر مانگی جاتی ہے کہ وہ ہستی عالمِ اسباب پر حکمران ہے اور بالاتر از حس و ادراک طریقے سے وہ اُس شخص کی حفاظت کر سکتی ہے جو اُس کی پناہ ڈھونڈ رہا ہے۔ پناہ کی یہ دوسری قسم ہی نہ صرف سورۂ فلق

اور سورۂ ناس میں مراد ہے بلکہ قرآن اور حدیث میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگنے کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد یہی خاص قسم کی پناہ ہے۔ اور عقیدۂ توحید کا لازمہ یہ ہے کہ اس نوعیت کا تعوّذ یا استعاذہ (پناہ مانگنا) اللہ کے سوا کسی اور سے نہ کیا جائے۔ مشرکین اس نوعیت کا تحفظ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں، مثلاً جنوں یا دیویوں اور دیوتاؤں سے مانگتے تھے اور آج بھی مانگتے ہیں۔ مادہ پرست لوگ اس کے لیے بھی مادی ذرائع و وسائل ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں، کیونکہ وہ کسی فوق الفطری طاقت کے قائل نہیں ہیں۔ مگر مومن ایسی تمام آفات و بلیات کے مقابلے میں، جن کو دفع کرنے پر وہ خود اپنے آپ کو قادر نہیں سمجھتا، صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا اور اسی کی پناہ مانگتا ہے۔ مثال کے طور پر مشرکین کے متعلق قرآن میں بیان کیا گیا ہے: وَ اَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ "اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے" (الجن ۶)۔ اور اس کی تشریح کرتے ہوئے ہم سورۂ جن حاشیہ ۷ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت نقل کر چکے ہیں کہ مشرکین عرب کو جب رات کسی سنسان وادی میں گزارنی پڑتی تو وہ پکار کر کہتے "ہم اس وادی کے رب کی (یعنی اس جن کی جو اس وادی کا مالک ہے) پناہ مانگتے ہیں"۔ بخلاف اس کے فرعون کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ کی پیش کردہ عظیم نشانیوں کو دیکھ کر فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ "وہ اپنے بل بوتے پر اکڑ گیا" (الذاریات، ۳۹)۔ لیکن خدا پرستوں کا رویہ قرآن میں یہ بتایا گیا ہے کہ جس چیز کا بھی وہ خوف محسوس کرتے ہیں، خواہ وہ مادی ہو یا اخلاقی یا روحانی، اس کے شر سے بچنے کے لیے وہ خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریم کے متعلق بیان ہوا ہے کہ جب اچانک تنہائی میں خدا کا فرشتہ ایک مرد کی شکل میں اُن کے سامنے آیا (جب کہ وہ نہ جانتی تھیں کہ یہ فرشتہ ہے) تو انہوں نے کہا اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا "اگر تو خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں" (مریم ۱۸)۔ حضرت نوح نے جب اللہ تعالیٰ سے ایک بے جا دعا کی اور جواب میں اللہ کی طرف سے اُن پر ڈانٹ پڑی تو انہوں نے فوراً عرض کیا رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ "میرے رب میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ میں تجھ سے ایسی چیز کی درخواست کروں جس کا مجھے علم نہیں ہے" (ہود ۔ ۴۷)۔ حضرت موسیٰ نے جب بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا اور انہوں نے کہا کہ آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں، تو انہوں نے جواب میں فرمایا اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ "میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ جاہلوں کی سی باتیں کروں" (البقرہ ۔ ۶۷)۔

یہی شان اُن تمام تعوّذات کی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتب حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ مثال

کے طور پر حضورؐ کی حسب ذیل دعاؤں کو ملاحظہ کیجئے:

عن عائشۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول فی دعائہ اللّٰھم انی اعوذ بک من شر ما عملت ومن شر ما لم اعمل۔ (مسلم)

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں ان کاموں کے شر سے جو میں نے کیے اور ان کاموں کے شر سے جو میں نے نہیں کیے" (یعنی اگر میں نے کوئی غلط کام کیا ہے تو اس کے بُرے نتیجے سے پناہ مانگتا ہوں، اور اگر کوئی کام جو کرنا چاہیے تھا میں نے نہیں کیا تو اُس کے نقصان سے بھی پناہ مانگتا ہوں، یا اِس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ جو کام نہ کرنا چاہیے وہ میں کبھی کر گزروں)۔

عن ابن عمر کان من دعاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللّٰھم انی اعوذ بک من زوال نعمتک، وتحول عافیتک، وفجاءۃ نقمتک وجمیع سخطک (مسلم)

ابن عمر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اِس سے کہ تیری جو نعمت مجھے حاصل ہے وہ چھن جائے، اور تجھ سے جو عافیت مجھے نصیب ہے وہ نصیب نہ رہے، اور تیرا غضب یکایک ٹوٹ پڑے، اور پناہ مانگتا ہوں تیری ہر طرح کی ناراضی سے۔

عن زید بن ارقم کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اللّٰھم انی اعوذ بک من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع ومن نفس لا تشبع ومن دعوۃ لا یستجاب۔ (مسلم)

زید بن ارقم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس علم سے جو نافع نہ ہو۔ اس دل سے جو تیرا خوف نہ کرے۔ اس نفس سے جو کبھی سیر نہ ہو۔ اور اس دعا سے جو قبول نہ کی جائے"

عن ابی ھریرۃ کان رسول اللہ صلی

حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ

اللہ علیہ وسلم یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْجُوْعِ فَاِنَّهٗ بِئْسَ الضَّجِیْعُ وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخِیَانَةِ فَاِنَّهَا بِئْسَتِ الْبِطَانَةُ
(ابوداؤد)

صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں بھوک سے کیونکہ وہ بدترین چیز ہے جس کے ساتھ کوئی رات گزارے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں خیانت سے کیونکہ وہ بڑی بدباطنی ہے"۔

عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَالْجُنُوْنِ وَالْجُذَامِ وَسَیِّئِ الْاَسْقَامِ
(ابوداؤد)

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں کوڑھ اور جنون اور جذام اور تمام بری بیماریوں سے"۔

عن عائشة ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یدعو بھؤلاء الکلمات اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ فِتْنَةِ النَّارِ وَمِنْ شَرِّ الْغِنٰی وَالْفَقْرِ۔
(ترمذی و ابوداؤد)

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ ان کلمات کے ساتھ دعا مانگا کرتے تھے: "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں آگ کے فتنے سے اور مالداری اور مفلسی کے شر سے"۔

عن قطبة بن مالک کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُنْكَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَهْوَاءِ
(ترمذی)

قطبہ بن مالک کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے "خدایا، میں برے اخلاق اور برے اعمال اور بری خواہشات سے تیری پناہ مانگتا ہوں"۔

شکل بن حمید نے حضورؐ سے عرض کیا مجھے کوئی دعا بتائیے۔ فرمایا کہو:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِیْ، وَمِنْ شَرِّ بَصَرِیْ، وَمِنْ شَرِّ لِسَانِیْ، وَمِنْ شَرِّ قَلْبِیْ وَمِنْ شَرِّ مَنِیِّیْ۔
(ترمذی و ابوداؤد)

خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں اپنی سماعت کے شر سے، اور اپنی بصارت کے شر سے، اور اپنی زبان کے شر سے، اور اپنے دل کے شر سے، اور اپنی شہوت کے شر سے۔

عن انس بن مالک کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْكَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْهَرَمِ

انس بن مالک کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے "خدایا میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی اور سستی اور بزدلی اور

وَالْبُخْلِ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ وَمِنْ فِتْنَةِ الْمَحْيَا وَالْمَمَاتِ (وفی روایۃ لمسلم) وَضَلَعِ الدَّيْنِ وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ۔ (بخاری ومسلم)	بڑھاپے اور بخل سے، اور تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب اور زندگی و موت کے فتنے سے (اور مسلم کی ایک روایت میں یہ بھی ہے) اور قرض کے بوجھ سے اور اس بات سے کہ لوگ مجھ پر غالب ہوں۔
عن خولۃ بنت حکیم السلمیۃ، سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول مَنْ نَزَلَ مَنْزِلًا ثُمَّ قَالَ اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ لَمْ يَضُرُّهُ شَيْءٌ حَتّٰى يَرْتَحِلَ مِنْ ذَالِكَ الْمَنْزِلِ۔ (مسلم)	خولہ بنت حکیم سُلمیہ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص کسی نئی منزل پر اترے اور یہ الفاظ کہے کہ "میں اللہ کے بے عیب کلمات کی پناہ مانگتا ہوں مخلوقات کے شر سے"، تو اسے کوئی چیز نقصان نہ پہنچائے گی یہاں تک کہ وہ اس منزل سے کوچ کر جائے۔

یہ حضورؐ کے چند تعوُّذات بطور نمونہ ہم نے احادیث سے نقل کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا کام ہر خطرے اور شر سے خدا کی پناہ مانگنا ہے نہ کہ کسی اور کی پناہ، اور نہ اس کا یہ کام ہے کہ خدا سے بے نیاز ہو کر وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرے۔

۱۵۳ اصل میں لفظ رَبُّ الْفَلَقِ استعمال ہوا ہے۔ فَلَق کے اصل معنی پھاڑنے کے ہیں۔ مفسرین کی عظیم اکثریت نے اس سے مراد رات کی تاریکی کو پھاڑ کر سپیدۂ صبح نکالنا لیا ہے کیونکہ عربی زبان میں فلق الصبح کا لفظ طلوعِ صبح کے معنی میں بکثرت استعمال ہوتا ہے، اور قرآن میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے فَالِقُ الْاِصْبَاحِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، یعنی "وہ جو رات کی تاریکی کو پھاڑ کر صبح نکالتا ہے" (الانعام-۹۶)۔ فَلَق کے دوسرے معنی خَلْق بھی لیے گئے ہیں، کیونکہ دنیا میں جتنی چیزیں بھی پیدا ہوتی ہیں وہ کسی نہ کسی چیز کو پھاڑ کر نکلتی ہیں۔ تمام نباتات بیج اور زمین کو پھاڑ کر اپنی کونپل نکالتے ہیں۔ تمام حیوانات یا تو رحمِ مادر سے برآمد ہوتے ہیں، یا انڈا توڑ کر نکلتے ہیں، یا کسی اور مانعِ ظہور چیز کو چیر کر باہر آتے ہیں۔ تمام چشمے پہاڑ یا زمین کو شق کر کے نکلتے ہیں۔ دن رات کا پردہ چاک کر کے نمودار ہوتا ہے۔ بارش کے قطرے بادلوں کو چیر کر زمین کا رخ کرتے ہیں۔ غرض موجودات میں سے ہر چیز کسی نہ کسی طرح کے اِنشقاق کے نتیجے میں عدم سے وجود میں آتی ہے، حتیٰ کہ زمین اور سارے آسمان بھی پہلے

ایک ڈھیر تھے جس کو پھاڑ کر انہیں جدا جدا کیا گیا، کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا۔ (الانبیاء-۳۰) پس اِس معنی کے لحاظ سے فَلَق کا لفظ تمام مخلوقات کے لیے عام ہے۔ اب اگر پہلے معنی لیے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ میں طلوعِ صبح کے مالک کی پناہ لیتا ہوں۔ اور دوسرے معنی لیے جائیں تو مطلب ہوگا میں تمام خلق کے رب کی پناہ لیتا ہوں اِس جگہ اللہ تعالیٰ کا اسم ذات چھوڑ کر اُس کا اسم صفت "رب" اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ پناہ مانگنے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے رب، یعنی مالک و پروردگار اور آقا و مربّی ہونے کی صفت زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ پھر رَبِّ الْفَلَقِ سے مراد اگر طلوعِ صبح کا رب ہو تو اس کی پناہ لینے کے معنی یہ ہوں گے کہ جو رب تاریکی کو چھانٹ کر صبحِ روشن نکالتا ہے میں اس کی پناہ لیتا ہوں تاکہ وہ آفات کے ہجوم کو چھانٹ کر میرے لیے عافیت پیدا کر دے، اور اگر اس سے مراد رَبِّ خَلْق ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ میں ساری خلق کے مالک کی پناہ لیتا ہوں تاکہ وہ اپنی مخلوق کے شر سے مجھے بچائے۔

۵ بالفاظِ دیگر تمام مخلوقات کے شر سے میں اُس کی پناہ مانگتا ہوں۔ اس فقرے میں چند باتیں قابلِ غور ہیں:

اوّل یہ کہ شر کو پیدا کرنے کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کی گئی، بلکہ مخلوقات کی پیدائش کی نسبت اللہ کی طرف اور شر کی نسبت مخلوقات کی طرف کی گئی ہے۔ یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اُن شرور سے پناہ مانگتا ہوں جو اللہ نے پیدا کیے ہیں، بلکہ یہ فرمایا کہ اُن چیزوں کے شر سے پناہ مانگتا ہوں جو اُس نے پیدا کی ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی مخلوق کو شر کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُس کا ہر کام خیر اور کسی مصلحت ہی کے لیے ہوتا ہے، البتہ مخلوقات کے اندر جو اوصاف اُس نے اس لیے پیدا کیے ہیں کہ اُن کی تخلیق کی مصلحت پوری ہو، اُن سے بعض اوقات اور بعض اقسام کی مخلوقات سے اکثر شر رونما ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ اگر صرف اِسی ایک فقرے پر اکتفا کیا جاتا اور بعد کے فقروں میں خاص خاص قسم کی مخلوقات کے شرور سے الگ الگ خدا کی پناہ مانگنے کا نہ بھی ذکر کیا جاتا تو یہ فقرہ مدعا پورا کرنے کے لیے کافی تھا، کیونکہ اس میں خدا کی ساری ہی مخلوقات کے شر سے خدا کی پناہ مانگ لی گئی ہے۔ اِس عام استعاذے کے بعد چند مخصوص شرور سے پناہ مانگنے کا ذکر خود بخود یہ معنی دیتا ہے کہ ویسے تو میں خدا کی پیدا کی ہوئی ہر مخلوق کے شر سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن خاص طور پر وہ چند شرور جن کا ذکر سورۂ فلق کی باقی آیات اور سورۂ ناس میں کیا گیا ہے، ایسے ہیں جن سے خدا کی امان پانے کا میں بہت محتاج ہوں۔

سوم یہ کہ مخلوقات کے شر سے پناہ حاصل کرنے کے لیے موزوں ترین اور مؤثر ترین اِستعاذہ اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اُن کے خالق کی پناہ مانگی جائے، کیونکہ وہ بہر حال اپنی مخلوق پر غالب ہے، اور اُن کے ایسے شرور کو بھی جانتا ہے جنہیں ہم جانتے ہیں اور ایسے شرور سے بھی واقف ہے جنہیں ہم نہیں جانتے۔ لہٰذا اُس کی پناہ گویا اُس حاکم اعلیٰ کی پناہ ہے جس کے مقابلے کی طاقت کسی مخلوق میں نہیں ہے، اور اس کی پناہ مانگ کر ہم ہر مخلوق کے ہر شر سے اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں، خواہ وہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو۔ نیز اس میں دنیا ہی کے نہیں آخرت کے بھی ہر شر سے استعاذہ شامل ہے۔

چہارم یہ کہ شر کا لفظ نقصان، ضرر، تکلیف اور اَلم کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے، اور اُن اسباب کے لیے بھی جو نقصان و ضرر اور تکلیف و الم کے موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً بیماری، بھوک، کسی حادثے یا جنگ میں زخمی ہونا، آگ سے جل جانا، سانپ بچھو وغیرہ سے ڈسا جانا، اولاد کی موت کے غم میں مبتلا ہونا، اور ایسے ہی دوسرے شرور پہلے معنی میں شر ہیں، کیونکہ یہ بجائے خود تکلیف اور اذیت ہیں۔ بخلاف اس کے مثال کے طور پر کفر شرک، اور ہر قسم کے گناہ اور ظلم دوسرے معنی میں شر ہیں کیونکہ ان کا انجام نقصان اور ضرر ہے، اگرچہ بظاہر ان سے فی الوقت کوئی تکلیف نہ پہنچتی ہو، بلکہ بعض گناہوں سے لذت ملتی یا نفع حاصل ہوتا ہو۔ پس شر سے پناہ مانگنا اِن دونوں مفہومات کا جامع ہے۔

پنجم یہ کہ شر سے پناہ مانگنے میں دو مفہوم اور بھی شامل ہیں۔ ایک یہ کہ جو شر واقع ہو چکا ہے، بندہ اپنے خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ وہ اسے دفع کر دے۔ دوسرے یہ کہ جو شر واقع نہیں ہوا ہے، بندہ یہ دعا مانگ رہا ہے کہ خدا مجھے اُس شر سے محفوظ رکھے۔

۵۔ مخلوقات کے شر سے عموماً خدا کی پناہ مانگنے کے بعد اب بعض خاص مخلوقات کے شر سے خصوصیت کے ساتھ پناہ مانگنے کی تلقین کی جا رہی ہے۔ آیت میں غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ غاسق کے لغوی معنی تاریک کے ہیں چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ارشاد ہوا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰی غَسَقِ الَّیْلِ "نماز قائم کرو زوالِ آفتاب کے وقت سے رات کے اندھیرے تک" (بنی اسرائیل - ۷۸)۔ اور وَقَبَ کے معنی داخل ہونے یا چھا جانے کے ہیں۔ رات کی تاریکی کے شر سے خاص طور پر اس لیے پناہ مانگنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اکثر جرائم اور مظالم رات ہی کے وقت ہوتے ہیں۔ موذی جانور بھی رات ہی کو نکلتے ہیں۔ اور عرب میں طوائف الملوکی کا جو حال اِن آیات کے نزول کے وقت تھا اس میں تو رات بڑی خوفناک چیز تھی، اسی

کے اندھیرے ہیں چھاپہ مار نکلتے تھے اور بستیوں پر غارت گری کے لیے ٹوٹ پڑتے تھے۔ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے وہ بھی رات ہی کے وقت آپ کو قتل کر دینے کی تجویزیں سوچا کرتے تھے تاکہ قاتل کا پتہ نہ چل سکے۔ اس لیے اُن تمام شرور و آفات سے خدا کی پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا جو رات کے وقت نازل ہوتی ہیں۔ یہاں اندھیری رات کے شر سے طلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگنے میں جو لطیف مناسبت ہے وہ کسی صاحب نظر سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔

اس آیت کی تفسیر میں ایک اِشکال یہ پیش آتا ہے کہ متعدد صحیح احادیث میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت آئی ہے کہ رات کو چاند نکلا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ اللہ کی پناہ مانگو ھٰذا الغاسق اذا وقب، یعنی یہ الغاسق اذا وقب ہے (احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر، ابن المنذر، حاکم، ابن مردویہ)۔ اس کی تاویل میں بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اِذَا وَقَبَ کا مطلب یہاں اِذَا خَسَفَ ہے، یعنی جبکہ وہ گہنا جائے یا چاند گرہن اس کو ڈھانک لے۔ لیکن کسی روایت میں بھی یہ نہیں آیا ہے کہ جس وقت حضورؐ نے چاند کی طرف اشارہ کر کے یہ بات فرمائی تھی اُس وقت وہ گرہن میں تھا۔ اور لغتِ عرب میں بھی اِذَا وَقَبَ کے معنی اِذَا خَسَفَ کسی طرح نہیں ہو سکتے۔ ہمارے نزدیک اس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ چاند نکلنے کا وقت چونکہ رات ہی کو ہوتا ہے، دن کو اگر چاند آسمان پر ہوتا بھی ہے تو روشن نہیں ہوتا، اس لیے حضورؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس کے (یعنی چاند کے) آنے کے وقت یعنی رات سے خدا کی پناہ مانگو، کیونکہ چاند کی روشنی مدافعت کرنے والے کے لیے اُتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی حملہ کرنے والے کے لیے ہوتی ہے، اور جرم کا شکار ہونے والے کے لیے اُتنی مددگار نہیں ہوتی جتنی مجرم کے لیے ہوا کرتی ہے۔ اسی بنا پر حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ان الشمس اذا غربت انتشرت الشیاطین، فاکفتوا صبیانکم واحبسوا مواشیکم حتی تذھب فحمۃ العشاء "جب سورج غروب ہو جائے تو شیاطین ہر طرف پھیل جاتے ہیں، لہٰذا اپنے بچوں کو گھروں میں سمیٹ لو اور اپنے جانوروں کو باندھ رکھو جب تک رات کی تاریکی ختم نہ ہو جائے"۔

۶؎ اصل الفاظ ہیں نَفّٰثٰتِ فِی الْعُقَدِ۔ عُقَد جمع ہے عُقدہ کی جس کے معنی گرہ کے ہیں، جیسی مثلاً تاگے یا رسی میں ڈالی جاتی ہے۔ نَفث کے معنی پھونکنے کے ہیں۔ نَفّٰثٰت جمع ہے نَفّاثَہ کی جس کو اگر عَلّامہ کی طرح سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والے مرد ہوں گے، اور اگر اسے مؤنث کا صیغہ سمجھا جائے تو مراد بہت پھونکنے والی عورتیں بھی ہو سکتی ہیں، اور نفوس یا جماعتیں بھی، کیونکہ عربی میں نفس اور جماعت دونوں مؤنث ہیں۔ گرہ میں

پھونکنے کا لفظ اکثر، بلکہ تمام ترمفسرین کے نزدیک جادو کے لیے استعارہ ہے، کیونکہ جادوگر عموماً کسی ڈور یا تاگے میں گرہ دیتے اور اس پر پھونکتے جاتے ہیں۔ پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ میں طلوعِ فجر کے رب کی پناہ مانگتا ہوں جادوگروں یا جادوگرنیوں کے شر سے۔ اِس مفہوم کی تائید وہ روایات بھی کرتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب جادو ہوا تھا تو جبریل علیہ السلام نے آکر حضورؐ کو معوّذتین پڑھنے کی ہدایت کی تھی، اور معوّذتین میں یہی ایک فقرہ ہے جو براہِ راست جادو سے تعلق رکھتا ہے۔ ابومسلم اصفہانی اور زمخشری نے نَفّٰثٰتِ فِی العُقَد کا ایک اور مفہوم بھی بیان کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس سے مراد عورتوں کی مکاری، اور مردوں کے عزائم اور آراء اور خیالات پر ان کی اثر اندازی ہے اور اس کو جادوگری سے تشبیہ دی گئی ہے، کیونکہ عورتوں کی محبت میں مبتلا ہو کر آدمی کا وہ حال ہو جاتا ہے گویا اس پر جادو کر دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر اگرچہ پُرلطف ہے، لیکن اُس تفسیر کے خلاف ہے جو سلف سے مسلّم چلی آتی ہے۔ اور اُن حالات سے بھی یہ مطابقت نہیں رکھتی جن میں معوّذتین نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ ہم دیباچے میں بیان کر چکے ہیں۔

جادو کے متعلق یہ جان لینا چاہیے کہ اس میں چونکہ دوسرے شخص پر بُرا اثر ڈالنے کے لیے شیاطین یا ارواحِ خبیثہ یا ستاروں کی مدد مانگی جاتی ہے اس لیے قرآن میں اسے کفر کہا گیا ہے: وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ "سلیمان نے کفر نہیں کیا تھا بلکہ شیاطین نے کفر کیا تھا۔ وہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے" (البقرہ-۱۰۲)۔ لیکن اگر اس میں کوئی کلمۂ کفر یا کوئی فعلِ شرک نہ بھی ہو تو وہ بالاتفاق حرام ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُسے سات ایسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا ہے جو انسان کی آخرت کو برباد کر دینے والے ہیں۔ بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا سات غارت گر چیزوں سے پرہیز کرو۔ لوگوں نے پوچھا وہ کیا ہیں یا رسول اللہ؟ فرمایا خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو، کسی ایسی جان کو ناحق قتل کرنا جسے اللہ نے حرام کیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جہاد میں دشمن کے مقابلہ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلنا، اور بھولی بھالی عفیف مومن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔

۵ حسد کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو اللہ نے جو نعمت یا فضیلت یا خوبی عطا کی ہو اس پر کوئی دوسرا شخص جلے اور یہ چاہے کہ وہ اُس سے سلب ہو کر حاسد کو مل جائے یا کم از کم یہ کہ اُس سے ضرور چھن جائے۔ البتہ حسد کی تعریف میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص یہ چاہے کہ جو فضل دوسرے کو ملا ہے وہ مجھے بھی مل جائے۔ یہاں حاسد کے شر سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اُس حالت میں مانگی گئی ہے جب کہ وہ حسد کرے، یعنی اپنے

دل کی آگ بجھانے کے لیے قول یا عمل سے کوئی اقدام کرے۔ کیونکہ جب تک وہ کوئی اقدام نہیں کرتا اُس وقت تک اُس کا جلنا بجائے خود چاہے بُرا سہی، مگر محسود کے لیے ایسا شر نہیں بنتا کہ اس سے پناہ مانگی جائے۔ پھر جب ایسا شر کسی حاسد سے ظاہر ہو تو اُس سے بچنے کے لیے اولین تدبیر یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگی جائے۔ اِس کے ساتھ حاسد کے شر سے امان پانے کے لیے چند چیزیں اور بھی مددگار ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان اللہ پر بھروسہ کرے اور یقین رکھے کہ جب تک اللہ نہ چاہے کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ دوسرے یہ کہ حاسد کی باتوں پر صبر کرے، بے صبر ہو کر ایسی باتیں یا کارروائیاں نہ کرنے لگے جن سے وہ خود بھی اخلاقی طور پر حاسد ہی کی سطح پر آجائے۔ تیسرے یہ کہ حاسد خواہ خدا سے بے خوف اور خلق سے بے شرم ہو کر کیسی ہی بیہودہ حرکتیں کرتا رہے، محسود بہر حال تقویٰ پر قائم رہے۔ چوتھے یہ کہ اپنے دل کو اُس کی فکر سے بالکل فارغ کرلے اور اُس کو اس طرح نظر انداز کر دے کہ گویا وہ ہے ہی نہیں۔ کیونکہ اُس کی فکر میں پڑنا حاسد سے مغلوب ہونے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ حاسد کے ساتھ بدی سے پیش آنا تو درکنار، جب کبھی ایسا موقع آئے کہ محسود اس کے ساتھ بھلائی اور احسان کا برتاؤ کر سکتا ہو تو ضرور ایسا ہی کرے، قطع نظر اس سے کہ حاسد کے دل کی جلن محسود کے اِس نیک رویہ سے مٹتی ہے یا نہیں۔ چھٹے یہ کہ محسود توحید کے عقیدے کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اس پر ثابت قدم رہے، کیونکہ جس دل میں توحید بسی ہوئی ہو اس میں خدا کے خوف کے ساتھ کسی اور کا خوف جگہ ہی نہیں پا سکتا۔

راہ و رسمِ منزل

(۲)

(سیّد اسعد گیلانی صاحب)

تحریکی جدوجہد اور مدت کار | اسلامی تحریک میں ادائیگی فرض کا مسئلہ کامیاب نتائج کے مسئلہ سے زیادہ اہم ہے۔ بعض اوقات اسلامی تحریک کے مخالفین تحریک کے حلقۂ اثر میں کامیاب نتائج کے مسئلے چھیڑ دیتے ہیں اور کارکن ان لوگوں کی نیت پر غور کیے بغیر اخلاص کے ساتھ اس طرز پر بھی سوچنے لگتے ہیں کہ ایک طویل مدت سے تحریک چل رہی ہے لیکن حصول اقتدار یا قیام نظام اسلامی کی منزل ابھی دور نظر آتی ہے۔ پھر مثال کے طور پر ایسی جماعتوں کے نام پیش کیے جاتے ہیں جو بعد میں اٹھیں اور تھوڑے عرصے میں اپنی منزل یعنی اقتدار تک پہنچ گئیں۔ یہ مغالطہ تحریک کو سمجھے بغیر اسے ایک عام سیاسی جماعت خیال کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسری سیاسی جماعتیں لوگوں کو ہر تدبیر اور ہر حربے سے کام لیتی ہیں۔ ہر مغالطے، دھوکے، جھوٹے وعدے، اور مبالغہ آمیز لالچ دے کر اپنی طرف مائل کر لیتی ہیں۔ لیکن ایک اسلامی تحریک لوگوں کو قائل کر کے ہی شعوری طور پر اپنے ساتھ لے سکتی ہے۔ وہ نہ دھوکہ دے سکتی ہے اور نہ ان کی حیوانی خواہشات کو ابھار کر اور ان کا شعور معطل اور ماؤف کر کے اپنے جال میں پھانس سکتی ہے۔ وہ تو انہیں سمجھا کر پورے فہم اور شعور کے ساتھ ہی اپنے ساتھ ملا سکتی ہے۔ دھوکے سے آیا ہوا آدمی دھوکے کی قلعی کھل جانے کے بعد شدید غصّے کی حالت میں اتنی ہی تیزی سے واپس پلٹ جاتا ہے جس تیزی سے وہ آیا ہوتا ہے۔ لیکن قائل ہو کر شعور کے ساتھ آیا ہوا آدمی کبھی واپس نہیں پلٹتا اور ہر مشکل اور ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس کے علاوہ مغالطوں جھوٹے وعدوں اور دھوکہ دہی سے کبھی اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسلام کے پاکیزہ مقاصد ناپاک ذرائع سے حاصل نہیں ہوتے۔

دوسرا پہلو کام کے نتیجے کا ہے۔ سیاسی جماعتیں مروجہ غالب باطل نظام کو قائم رکھ کر اس کی خدمت کے لیے میدان میں آتی ہیں اور ان سے صرف کام کرنے والے ہاتھ ہی بدلتے ہیں۔ جبکہ تحریک اسلامی اس نظام

کو ہمہ پہلو اکھاڑ اور راہ ہموار کر کے ایک دوسرا صالح نظام لانے کی کوشش کر رہی ہوتی ہے۔ ان دونوں کاموں میں مدت کار کا بنیادی فرق ہے۔ ایک شخص تو ایک عمارت میں صرف چند دنوں کے لیے کمرہ کرائے پر لینا چاہتا ہے، لیکن دوسرا شخص اس عمارت کی جگہ نئی عمارت بنانا چاہتا ہے۔ دونوں کے کام کی مدت میں بھی لازماً فرق ہوگا اور ان کے کام کے نتائج بھی بہت مختلف ہوں گے۔

تیسرا اہم پہلو یہ ہے کہ کامیابی کو مہینوں اور سالوں کے ساتھ نہیں بلکہ معاشرے میں کیے ہوئے کام کے نتائج کے ساتھ ناپا جائے گا۔ باطل پر فیصلہ کن ضرب لگانے کے لیے کسی تحریک کو معاشرے میں سے کتنی بڑی ٹیم فراہم ہوتی ہے، اور وہ ٹیم اخلاقی و ذہنی حیثیت سے کس صلاحیت کی ہے، اور وہ کن ذرائع و وسائل سے بہرہ ور ہے، یہ سب کچھ تبلیغی کام کے حقیقی نتائج اور افرادی قوت پر ہی منحصر ہے۔ مثلاً حضورؐ اکرم کو اپنے معاشرے میں سے کارکنوں کی اتنی تعداد مل گئی کہ وہ چودہ سال کی مدتِ تیاری گزارنے کے بعد باطل نظام پر کاری ضرب لگانے کے قابل ہو گئے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کو ۹۵۰ سال معاشرے میں کام کے باوجود بھی اتنی افرادی قوت نہ مل سکی کہ وہ نظام باطل پر آخری ضرب خود لگا سکتے اور اسلامی تحریک مطلوبہ صالح انقلاب خود برپا کر سکتی۔ چنانچہ ایسے متعفن بوسیدہ اور ناکارہ معاشرے کو قدرت نے خود آگے بڑھ کر غرقِ آب کر دیا۔ ایک باطل تحریک کے داعی مارکس نے ۱۸۴۹ء میں اشتراکی منشور پیش کیا اور اس کی تحریک بھی تحریک ۱۹۱۷ء میں پورے ۶۸ سال کے بعد اس قابل ہو سکی کہ معاشرے پر جبر و تشدد سے قبضہ کر سکے۔ اگرچہ اس کام کے لیے بھی اسے بہت سے اصول ترک کرنے پڑے۔ ان واقعات کی روشنی میں اجتماعی نفسیات سے آگاہ حقیقت پسند نظریہ نہیں دیکھتی کہ کس تحریک کی مدت کار کتنی ہے۔ بلکہ یہ دیکھتی ہے کہ معاشرے میں سے افراد کار کس تناسب سے ملے ہیں اور وہ تناسب نظام غالب پر ضرب لگانے کے لیے کافی ہے یا نہیں۔ اگر کارکنوں کی تعداد کافی ہے تو لازماً ایک انقلابی ضرب لگائی جائے گی اور اگر تعداد کافی نہیں ہے تو افراد کو چھانٹنے اور اپنے ساتھ ملاتے چلے جانے کے عمل کو مسلسل اور پیہم جاری رکھا جائے گا تاآنکہ معاشرے کے تناسب سے انقلابی کارکنوں کی تعداد کافی ہو جائے۔

تحریک میں رہبری اور رہنمائی کا مقام تحریکوں میں رہنمائی کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہوتا ہے اور اگر کسی تحریک کو حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہونا پڑے اور منزل کی مسافت لمبی نظر آئے تو بعض اوقات تھکے ہوئے کارکن یا پرجوش انقلابی ساتھی تحریک کی قیادت کے بارے میں نااہلی سست روی اور حکمتِ کار سے عدم واقفیت اور نااہلیت

کے وسوسے میں مبتلا ہونے لگتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کا ایک پہلو ہے۔ اس کے متعدد اسباب میں سے ایک اہم سبب تحریک کی بنیادی فکر سے عدم مطابقت اور اس کے نظریاتی اور صفاتی پہلوؤں سے بے خبری بھی ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ہر نظریاتی تحریک کی قیادت ہی اس نظریہ کی فکری اور عملی لحاظ سے سب سے بڑی علم بردار ہوتی ہے اور وہ اس نظریے کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔ نظریاتی تحریک کی قیادت کے لیے صرف جوش و جذبہ اور صرف جسمانی قوت و توانائی ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ ایسی ہر صفت سے زیادہ اہم صفت اس نظریے کی فکری بنیاد پر گہری نظر، اپنے نصب العین کے لیے ایثار و قربانی کا وسیع ریکارڈ اور اپنی تحریک کے مزاج و کردار سے مکمل مطابقت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ جس طرح اسلامی فوج کے لیے ایک معمولی سپاہی بھی مخصوص عقائد و عمل کا حامل مجاہد ہوتا ہے اسی طرح ایک اسلامی تحریک کا قائد بھی اس سے ہزار گنا زیادہ مخصوص نظریاتی صفات میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ مثلاً دورِ حاضر کی اسلامی تحریک نے اپنے قائدین کے لیے مندرجہ ذیل اوصاف کو لازمی معیار قرار دیا ہے۔

۱۔ وہ نہ امارت کا خود امیدوار ہو اور نہ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں آئی ہو جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ امارت کا خود خواہشمند ہے یا اس کے لیے کوشاں ہے۔

۲۔ ارکان جماعت اس کے تقویٰ، علم کتاب و سنت، امانت و دیانت، دینی بصیرت، تحریک اسلامی کے فہم، اصابت رائے، تدبر، قوت فیصلہ، راہ خدا میں ثبات و استقامت اور نظم جماعت کو چلانے کی اہلیت پر اعتماد رکھتے ہوں۔

ظاہر ہے کہ ان اوصاف کا تعلق کسی شخص کی عمر، امارت، نسب یا خاندانی وجاہت سے نہیں ہے۔

ایک نظریاتی اسلامی تحریک تو اپنے یہ معیاری کارکن بھی برس ہا برس کی مسلسل تربیت کے بعد ہی تیار کرتی ہے۔ تحریک کے نصب العین سے آگاہی کا تفصیلی علم، اسلام کے عائد کردہ فرائض کی پابندی اور منکرات سے اجتناب کا تدریجی عمل، چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو انفرادی اور اجتماعی کوشش سے دور کرنے کی پیہم کوشش، تحریک کے داخلی ماحول اور حقیقی مسائل پر تحریکی زاویہ نگاہ بنانے کا فہم و شعور اور وجدان، یہاں تک کہ کتابوں سے گزر کر خود ایک بدلتی ہوئی کتاب بن جانے کا عمل اور تحریک کی چلتی پھرتی نشانی اور علامت بن جانے کا کام۔ یہ مراحل چند دنوں میں تو طے نہیں ہو جاتے۔ اس کے لیے وقت لگتا ہے اور جس طرح انسان کا

تجربہ سونے کی طرح قیمتی ہوتا ہے اسی طرح ہر تحریک میں باشعور پرانا آدمی سونے سے بڑھ کر قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے ایسے لوگوں کے لیے سابقون الاولون کی اصطلاح استعمال کی ہے اور خلیفۂ راشد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا حال تو یہ تھا کہ وہ عرب کے بڑے بڑے نو مسلم سرداروں کی نسبت تحریک کے پرانے غریب کارکنوں پر زیادہ توجہ صرف کیا کرتے تھے اور سرداروں سے کہتے تھے کہ جب تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کر رہے تھے تو ان لوگوں نے حضورؐ کا ساتھ دیا تھا۔ یہی اِن کا سب سے بڑا اعزاز ہے۔

چاروں خلفائے راشدین پر نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس درجے میں وہ تحریک کے اندر پرانے، جہاندیدہ، ہر آزمائش میں آزمودہ اور ہر ایثار و قربانی پیش کیے ہوئے ہوتے تھے اسی درجے میں وہ تحریک کے اندر آگے کی صفوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ نظریاتی تحریک کی قیادت کسی سیاسی جماعت کی صدارت کی مانند نہیں ہوتی کہ اب فلاں ابن فلاں کو بھی موقع دیا جائے چونکہ وہ پرجوش تقریر کرتا ہے۔ پرجوش تقریر ممکن ہے کہ کسی درجے میں قیادت کی ایک صفت قرار دے لی جائے۔ لیکن اسلامی قیادت کے لیے صبر و حکمت، تدبر، دانائی، فہم و فراست، ایثار و قربانی، زندگی کی ساری متاع کو اس راہ میں لٹا دینے کا داعیہ اور جذبہ اور بے غوغی و بے لوثی و بے غرضی کی دوسری صفات بھی اعلیٰ درجے میں مطلوب ہوتی ہیں۔ نظریاتی تحریکوں کی قیادت ہمیشہ نظریے کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایثار پیشہ لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔ دورِ انبیاء کے بعد ہر اسلامی تحریک کے قائد غیر معصوم نیک لوگ ہی ہوں گے اور ان سے کوتاہیاں بھی ہوں گی، اس لیے کہ کامل قیادت تو سوائے حضورِ اکرمؐ کے کسی کی بھی نہیں ہو سکتی۔ کوئی شخص بھی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس لیے اسلام کا شورائی نظام انفرادی رائے کی کمزوریوں کو رفع کر دیتا ہے اور قائدین میں بھی جن صفات کی کمی ہوتی ہے کارکن اپنی ان صلاحیتوں کی پیشکش کر کے قیادت کی ان خامیوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ بنیانِ مرصوص وجود میں آتی ہے جس میں ہر اینٹ دوسری کو سہارا دے رہی ہوتی ہے۔

نظریاتی قیادت کسی بامقصد گروہ کی اجتماعی جدوجہد کی سربراہی کا عمل ہوتا ہے۔ یہاں وہی شخص کام دے سکتا ہے جو سوچ بچار کے لیے دماغ رکھے، راہ و رسمِ منزل سے آگاہ ہو، اپنے نظریے کو اپنے رگ و پے میں سموئے ہوئے ہو، عمل و کردار میں آزمودہ و پختہ کار اور ایثار و قربانی کا مجسمہ ہو اور اس کی دیانت و امانت مسلّمہ ہو۔ یہ صرف جسمانی توانائی اور جوش و جذبہ کا کام نہیں ہے۔ یہ ذہنی اور فکری توانائی، کردار کی مضبوطی،

عمل کی پختگی، نظر کی وسعت، دور اندیشی اور عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا کر مستقبل کے اندھیرے کی طرف بصیرت کی روشنی میں اس طرح آگے بڑھنے کا کام ہے کہ نہ کسی چٹان سے ٹھوکر کھائے، نہ کسی کھائی میں گرے، نہ کسی جانگاہ حادثے سے آسانی سے دوچار ہو، اور قافلے کو صحیح و سلامت لے کر منزل کی طرف آگے ہی آگے بڑھنے کا عمل بتدریج جاری رکھے۔ کسی نظریاتی جماعت کی قیادت مضبوط گلے، بلند بانگ نعرے اور جوش و خروش کی تقریر و تحریر سے عبارت نہیں ہوتی، بلکہ یہ فکر و کردار کی مضبوطی ایثار و قربانی کی وافر مقدار اور صبر و حکمت اور فہم و فراست سے عبارت ہوتی ہے۔

انقلاب قیادت کا عمل اسلامی تحریک ہمہ پہلو ایک انقلابی اور عملی تحریک اس وقت بنتی ہے جب وہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں سے جمع کی ہوئی افرادی قوت کو نظام کی تبدیلی کے لیے استعمال کرتی ہے اور نظام حکومت کو صالح بنانے کی عملی جدوجہد کرتی ہے۔ یہ اقدام معمولی بات نہیں ہے کہ افرادی قوت کو باطل کے آخری قلعے پر بھرپور ضرب لگانے کے لیے استعمال کیا جائے تاکہ اہل باطل کو یہ گمان باقی نہ رہے کہ تحریک اسلامی محض مبلغین کا کوئی گروہ ہے، بلکہ یہ بات کھل کر اس کے سامنے آجائے کہ یہ تحریک سرفروش مجاہدین فی سبیل اللہ کا دستہ ہے، اور اس کا عزم و ارادہ باطل کو زندگی کے ہر گوشے سے بے دخل کر کے اسلام کو زندگی کے ہر زاویے پر حاوی کرنا ہے۔

باطل کے آخری قلعے پر حملے کا کام کسی نام نہاد مسلم معاشرے کے قائم کردہ جمہوری نظام میں تولا محالہ جمہوری طریقے پر ہوگا اور وہ معاشرے کو بتدریج اسلامی بنانے کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ انجام پائے گا۔ دوسری صورتوں میں ملک قوم اور نظام مملکت کے لحاظ سے جس جس نوعیت کے حالات ہوں گے اسی کے مطابق تحریک کی اجتماعی مشاورت اپنا طریق کار طے کرے گی۔ انقلاب قیادت، یا دوسرے لفظوں میں نیک لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت منتقل کرنے کے اہم ترین کام میں ظاہر ہے کہ جمہوری اور افرادی قوت کا استعمال ناگزیر ہوگا۔ اسلامی نظام کے قیام سے بڑھ کر تختۂ زمین پر اور کوئی بڑا نیکی کا کام نہیں ہے اور یہ عظیم ترین نیکی سرانجام دینے کے لیے اخلاقی حدود میں رہتے ہوئے زندگی کا ہر وسیلہ استعمال کرنا لازم بھی ہوگا اور برحق بھی۔

نیک لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور کا آجانا اسلامی انقلاب کے سارے عمل کا اہم ترین اور موثر ترین حصہ ہے اس لیے باطل کو ہٹا کر نظام حق سے بدل دینے کا سارا کام نیک لوگوں کے ذریعے

ہی انجام پا سکتا ہے۔ مسلمان معاشرے، اور مسلمان قوموں کے ملکوں کی اخلاقی، معاشی، سماجی اور سیاسی تباہی کی تمام تر ذمہ داری ان پر ہے جو فاسق و فاجر، دھوکے باز، نعرہ باز، فریب کار، اور بد کردار حکمرانوں پر عائد ہوتی ہے جو خلافت راشدہ کے بعد بالعموم مسلمانوں پر جبر و تشدد سے مسلط ہوتے رہے ہیں، اور جس طرح باپ سے بیٹے کو جاگیر اور بھیڑوں کا گلہ وراثت میں منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح شاہی گھرانے میں پیدا ہونے کے خوشگوار حادثے کے نتیجے میں بادشاہ باپ سے ولی عہد بیٹا ملک اور قوم کو وراثتاً حاصل کرتا رہا ہے۔ مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ حضورؐ اکرم کی عظیم اسلامی تحریک کی جانگسل جدوجہد کے نتیجے میں جو اسلامی انقلاب عرب میں رونما ہوا اُس کی روشنی سارے عالم میں دکھائی دی۔ اس انقلاب نے بدترین رواجی قوانین کی جگہ اسلامی قوانین کا اجرا کیا، بدترین معاشرے کی اصلاح کر کے اسے دنیا کا اعلیٰ ترین مہذب اور با اخلاق معاشرہ بنا دیا جس کے مجرم بھی خود قاضیوں کے پاس جا کر اعترافِ جرم کرتے تھے تاکہ آخرت کی رسوائی سے بچ سکیں، بدکردار لوگوں کی جگہ قوم میں سے بہترین نیک نفس خدا ترس اور شریف لوگوں کو ابھار کر وہ سربراہی کے مقام پر لے آیا جن کا نام اُس نے خلفائے راشدین (ہدایت یافتہ رہنما) رکھا اور سیاسی مملکتوں کی تاریخ میں پہلی بار "نیک حکمران کا انقلابی نظریہ" پیش کر کے دنیائے سیاست میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا اور آئندہ کے لیے بھی یہ شرط لگا دی کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ مسلمانوں میں نیک لوگ ہی رہنما ہوا کریں۔ بدکردار لوگوں کے لیے مسلمان معاشرے میں رہنمائی کا مقام نہیں بلکہ ذلت و رسوائی اور خجالت و شرمندگی کا مقام ہے۔ آج تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ زوال کی ابتدا میں مسلمانوں میں سب سے پہلے نیک لوگوں کے ہاتھ سے قوم کی سربراہی نکلی۔ پھر اسی کے نتیجے میں معاشرے کا اخلاق تباہ ہوا اور اس کے بعد تدریج اسلامی قوانین بھی معطل ہوتے چلے گئے اور ان کی جگہ باطل طاغوتی قوانین کا اجرا ہوتا چلا گیا۔ اس امر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بگاڑ کی اصل جڑ نیک لوگوں کے ہاتھ سے حکومت کا چلا جانا ہے اور جب ایک بار یہ تبدیلی واقع ہو جائے تو پھر مسلمان قوم کو تباہی و بربادی ذلت و رسوائی اور شکست و غلامی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری تمام تر ذلت و رسوائی اور انحطاط و زوال کا باعث نیک لوگوں کی بجائے بُرے لوگوں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی حکومت کا منتقل ہو جانا ہے۔ اس لیے اس بنیادی خرابی کو قائم رکھتے ہوئے کوئی مادی ترقی، کوئی صنعتی تبدیلی، کوئی اعلیٰ تعلیم اور نہ کوئی سائنسی ترقی کام نہیں دے سکتی۔ اس خرابی کے ساتھ مسلمان زوال کے گڑھے میں نیچے ہی نیچے اترتے چلے جائیں گے اور ہمیں آخری تباہی سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ اس لیے کہ جس کسی کو تو

کی رہنمائی میں سفر کرنا پڑے وہ کوڑے اور غلاظت کے ڈھیر تک پہنچ کر رہتا ہے۔

میرے خیال میں اسلامی انقلاب کے لیے بنیادی اہمیت کی بات حکومت پر صاحب نظریہ صاحب کردار اور اسلام کو زندگی کا مشن بنا کر کام کرنے والے مخلص اور نیک لوگوں کا قبضہ ہے۔ بس اسلامی انقلاب کی ابتدا بھی ہے۔ صرف اسی طریقے سے معاشرہ حقیقی اسلامی تغیر سے دوچار ہو سکتا ہے۔ بُرے لوگوں کی جگہ نیک لوگوں کو لانے کا کام اصل اسلامی انقلاب کی طرف سب سے عظیم اقدام ہے۔ اس کام کے لیے حالات کے مطابق دونوں راستے ممکن ہیں۔ جمہوری طریقہ بھی اور انقلابی بھی۔ جو تحریک بھی ان دونوں میں سے کسی ایک راستے پر کام کرے اسے بہرحال مختلف مدارج میں سے گزرنا ہوگا: تبلیغ، تنظیم، توسیع اور اقدام۔ اقدام بھی ایک ہی قسم کا نہ ہوگا۔ یہ کام جمہوری جدوجہد میں انتخابات اور عوامی تائید کے ذریعے بھی ہوگا، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی تحریک کے طریقے پر کام کرتے ہوئے عوامی تائید اور اسلامی قوت سے ہوگا۔ ظاہر ہے کہ طریق کار نوعِ قوم، اس کے نظامِ مملکت اور سیاسی حالات کی نسبت سے ہی اختیار کیا جائے گا۔

انقلابی قیادت کے راست اقدام سے مراد کسی باطل نظام کی تبدیلی کے لیے آخری مرحلے کی لڑائی کے میدان میں داخل ہونا ہے جہاں سے مخالف نظام کی آخری پناہ گاہ زد میں آ جاتی ہے۔ اس کے لیے طریقہ بہرحال قوت کے استعمال کا ہی ہوگا، چاہے وہ عوامی تائید کی جمہوری قوت ہو یا جانگسل کشمکش کی انقلابی قوت۔

سوشلسٹوں کے طریقے پر خونی انقلاب لانے اور معاشرے کو خانہ جنگی میں جھونک دینے کے لیے سیاست کے اسلامی آداب جدوجہد میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فتنہ و فساد، معاشرے کی تباہی، اصلاح سے بڑھ کر بگاڑ اور نیکی اور بھلائی سے بڑھ کر برائی کا پھیل جانا کبھی بھی اسلامی تحریک کو منظور نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اس طرح تو شیطان کے مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ اسلام میں قوت کے استعمال پر سخت شرائط اور پابندیاں ہیں۔ ظالم اور جابر لوگ تو اپنی گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے زبان، علاقہ، مفاد اور نسل کے جھگڑے کھڑے کر کے ہزاروں کو قتل کروا سکتے ہیں اور ان کی لاشوں پر اپنی فتح کے شادیانے بھی بجا سکتے ہیں۔ لیکن ایک مصلح تحریک یہ کام کیسے کر سکتی ہے جسے معلوم ہے کہ ایک مسلمان کا خونِ ناحق بھی ساری خلقت کو ناحق قتل کر دینے کے مترادف ہے اور یہ ناقابل معافی جرم ہے۔ ظاہر ہے کہ سلامتی اور رحمت کے دین اسلام کو اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے۔ وہ تو خلقِ خدا کی عزت و آبرو اور جان و مال کا محافظ

دین ہے۔

حضورؐ اکرم ۱۳ سال تک مکے میں زبردست آزمائشوں میں سے گزرتے اور مصائب جھیلتے رہے۔ ان کے ساتھ بڑے بڑے خیبر شکن لوگ تھے لیکن چونکہ تلوار کی قوت کے استعمال کا حکم نہ آیا تھا اس لیے ظلم و ستم سہتے، صبر و شکر کرتے اور آزمائش کی بھٹی سے گزر کر کندن بنتے رہے۔ البتہ جب سرحد پار کر کے مدینے چلے گئے اور نقل مکانی نے ایک اسلامی ریاست قائم کر کے ظلم سہنے کے زمانے اور ظلم کا جواب قوت سے دینے کے دور کے درمیان ایک واضح لکیر کھینچ دی تو پھر معرکۂ بدر ہی برپا ہوا۔

معرکۂ بدر میں تناسبِ قوت ایک خاص انداز کا تھا جو استعمالِ قوت کے ذریعے انقلابی جدوجہد کرنے والوں کے لیے نہایت غور طلب مسئلہ ہے۔ قرآن نے اجازت دی کہ تم کو کفار سے لڑنے کے بڑے ارمان تھے تو لو اب اجازت ہے کہ اللہ کی راہ میں جانیں ہتھیلی پر رکھ کر نکلو۔ پھر یہ بھی بتایا کہ اگر تم اعلیٰ صفتِ ایمان سے موصوف اور اعلیٰ مقامِ ایمان پر فائز ہو گئے تو ایک ایک مومن کے مقابلے میں دس دس کافر بھی شکست کھا جائیں گے ورنہ دوسری صورت میں ایک ایک مومن دو دو کافروں پر بھاری ہو گا.....

اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ..... (انفال-۶۵)	اگر تم میں سے دس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے۔

لیکن اگر تم میں کمزوری پائی گئی تو:

فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ..... (انفال ۶۶)	"پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے"

بدر کی لڑائی چونکہ اسلام و کفر کے مقابلہ کی پہلی لڑائی تھی اس لیے حضورؐ اکرم اپنا لشکر لے کر جب میدانِ جہاد میں تشریف لائے تو تناسب ایک اور تین کا تھا۔ یعنی اعلیٰ سے کم اور ادنیٰ سے زیادہ۔ اُس وقت یہی کچھ میسر بھی تھا اور اللہ نے فتح و نصرت دے کر اس تناسب پر بھی اپنی مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اس کے بعد بھی اپنی پوری تاریخ میں مسلمان اسلامی نظام کی توسیع کے لیے جب کبھی کفار سے برسرِپیکار ہوئے ان کا تناسبِ تعداد کفار سے ہمیشہ کم ہی رہا۔ حضورؐ کا پہلی بار مقرر کردہ تناسب ایک اور تین کا ہے۔ یہ ایک عمدہ معیارِ تعداد ہے جو کسی بعد میں آنے والی اسلامی تحریک کے لیے نمونہ بن سکتا ہے۔ اس تناسب سے ابھی افرادی طاقت کم ہو تو اسے تبلیغ کے ذرائع سے اسے بڑھاتے رہنے پر ساری قوتیں، توانائیاں، جوانیاں اور

جوش و خروش استعمال کرنا چاہیے اور روابطۂ عالم کے ذریعے خلق خدا تک اپنی دعوت کو پہنچانے کا کام برابر جاری رکھنا چاہیے۔ یعنی ابھی لوہا اتنا گرم نہیں ہوا کہ اس پر نتیجہ خیز ضرب لگائی جا سکے۔ اور ٹھنڈے لوہے پر ضربیں لگانے سے پریشانی اور ضیاعِ قوت تو ہوتا ہے لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ کے مطابق اللہ کی پارٹی ہی غالب آنے والی ہے لیکن اس کے لیے چند شرائط ہیں جنہیں پورا کیے بغیر اسلامی تحریک کبھی اپنی قوتِ مزاحمت کا استعمال نہیں کر سکتی۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ قوت مسلمانوں کے خلاف استعمال نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ خانہ جنگی مسلمانوں کی دنیوی تباہی اور آخرت کی بربادی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف یہ قوت استعمال کی جا سکتی ہے ان کے خلاف بھی پہلے مناسب اور موثر تیاری خود قرآن کے حکم کی رو سے کرنا نہایت ضروری ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ ..... (انفال - ۶۰)	اور جہاں تک تمہارا بس چلے زیادہ سے زیادہ طاقت اور بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلے کے لیے مہیا رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کر دو .....

ظاہر ہے کہ تیاری اور قوت کی فراہمی اور اس کے استعمال کے تین مدارج ہیں۔

(۱) عقیدہ و ایمان کی قوت۔ (۲) وحدت و اتحاد و ارتباط و تنظیم کی قوت۔ (۳) زورِ بازو اور اسلحہ کی قوت۔

جب تک ان تینوں قوتوں سے درجہ بدرجہ کوئی اسلامی تحریک اس طرح تیار نہ ہو جس طرح تیار ہونے کا حق ہے اس کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ قوتِ بازو کا استعمال کر کے اپنے اور دوسروں کے لیے تباہی اور مصیبت کا باعث بنے۔ استعمالِ قوت کے لیے وصفِ قوت سے آراستہ اور متصف ہونا بھی ضروری شرط ہے۔ ورنہ پھر یہ ہلاکت کا گڑھا اور دنیا و آخرت کی رسوائی ہے۔ تحریک اسلامی کا کام حکمت و دانائی کا کام ہے خالی خولی اندھی نعرے بازی اور سر پھوڑنے کا کام نہیں ہے۔ نتائج کا تخمینہ اور جائزہ

لیے بغیر قوت کا استعمال ایسی ہلاکت ہے جس کا اسلامی تحریک کے طریقِ کار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مار دھاڑ لوٹ کھسوٹ، تباہی و بربادی، گھیراؤ جلاؤ جیسے حربوں سے تحریک اسلامی بھی اگر کام لے تو وہ تحریک اسلامی نہیں ہے۔ اور ان تدابیر کے ذریعے اگر وہ کوئی انقلاب بھی لے آئے تو وہ انقلاب اسلامی نہیں ہو سکتا۔

ایک حدیث میں ہے:

جنگ کی دو قسمیں ہیں۔ جس نے اللہ کی خوشنودی پیش نظر رکھی، امام کے حکم کی پیروی کی، پاکیزہ مال خرچ کیا، ساتھی کے ساتھ اچھا معاملہ کیا، فساد سے پرہیز کیا، تو اس کا سونا اور جاگنا سب کا سب اس کے لیے اجر قرار پائے گا۔ لیکن جس نے محض فخر اور دکھاوے اور شہرت حاصل کرنے کے لیے جنگ کی امام کی نافرمانی کی اور زمین میں فساد برپا کیا تو اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

غرض اہل باطل کے خلاف فولادی قوت کا استعمال کرنے کے لیے تحریک اسلامی پر کچھ پابندیاں ہیں اور وہ پابندیاں بعض شرائط پوری کرنے سے ہی اٹھ سکتی ہیں۔ مکہ میں حالتِ ضعف میں تیرہ سال تک جنگ نہ کرنے اور مکہ سے نکل آنے اور اپنی مضبوط بنیاد بنا لینے کے بعد جنگ کرنے کی اجازت مل جانے سے بعض شرائط خود بخود سامنے آجاتی ہیں جن کا تذکرہ ضروری ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف راست اقدام یا مطالبہ جہاد کرنے والوں کے مقدوم میں اعلانِ جہاد کیا جائے ان پر پہلے اتمام حجت کی حد تک تبلیغ کا حق ادا ہونا ضروری ہے۔ اس درجہ تبلیغ کے بغیر کسی قوم یا حکومت کے خلاف براہ راست دعوت مبارزت درست نہیں ہے۔ البتہ مدافعت کے لیے جنگ ہو سکتی ہے۔ اور خلق خدا پر تبلیغ کے راستے کھولنے کے لیے بھی کافر جباروں کا شکنجہ توڑنے کے لیے جنگ ہو سکتی ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اسلامی نظام کے لیے جنگ نیک اور صالح گروہ کے ذریعے سے کی جائے اور اس کی رہنمائی بھی نیک اور صالح افراد ہی کریں۔ اُن لوگوں کا فلاح انسانیت کے علم بردار اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے جہاد کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا جو خود فساد برپا کرنے والے اور اخلاقی حدود سے بے نیاز اور فتنوں میں ملوث اور آلودہ ہوں۔ یہ تو اسلامی نظام کی فطرت کا ہی تقاضا ہے کہ اس کے برپا کرنے کی جنگ صرف اس کے مخلص معتقد اور وفادار پیروکاروں کے ذریعے ہی لڑی جائے جن کے سامنے رضائے الٰہی کے حصول اور اقامت دین کے فریضہ کی ادائیگی کے سوا اور دوسری کوئی غرض نہ ہو، نہ دنیوی مفاد، نہ عہدے

نہ دولت نہ عزت و جاہ اور نہ کوئی اور غرض، اور حد یہ ہے کہ کسی خاص فرد کی شخصی عداوت بھی نہیں۔ وہ اللہ ہی کے لیے بغض اور اسی کے لیے محبت کا نمونہ ہوں۔ اس لیے جو لوگ اسلام کے لیے جنگ کرنا چاہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنے نفس سے جنگ کر کے اسے اسلام کا تابع بنائیں پھر اسلامی مقصد کے لیے جنگ یعنی راست اقدام کا نام لیں۔

تمام انبیاء نے اپنے سارے جہاد مومنین کے ذریعے کیے اور حضورؐ کے سامنے کفار قریش نے اقتدار کی جو پیشکش کی اسے حضورؐ نے مسترد کر دیا۔ چنانچہ جن صالحین کے ذریعے اللہ تعالیٰ تحریک اسلامی کی طرف اقتدار منتقل کرتا ہے ان کی تربیت کے لیے انہیں ان مراحل میں سے ضرور گزارتا ہے جن کا ان آیات میں ذکر کیا گیا ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ (البقرہ-۱۵۵)	اور ہم ضرور تمہیں خوف و خطر، فاقہ کشی، جان و مال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمہاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں انہیں خوشخبری دے دو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ جنگ ایک با اختیار اور با اقتدار امیر کی قیادت میں لڑی جائے، یعنی ایسا امیر جو اپنی جماعت پر بزور قوت شریعت کے احکام نافذ کرنے کی پوزیشن میں ہو اور وہ خود بھی خدا کے سوا کسی دوسرے بالاتر اقتدار کا محکوم نہ ہو۔ اس لیے حضرت سید احمد شہیدؒ نے جب جہاد کرنے کا فیصلہ کیا تو انگریز کے علاقے سے ہجرت کر کے سرحد کے آزاد علاقے میں تشریف لے گئے جہاں وہ پوری طرح ہر اقدام کرنے کے لیے آزاد تھے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ انارکی نہ پھیلے اور جنگ کرنے والی جماعت فتنہ و فساد برپا کرنے کے جرم میں مبتلا نہ ہو جائے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ تحریک اسلامی کے علمبردار اہل حق کے لیے لازم ہے کہ وہ معاشرے کے وسیع میدان میں اپنے افکار کے بیج بوتے چلے جائیں اور اپنی تبلیغی جدوجہد سے قوم کے اندر سے سعید روحوں کو چھانٹ چھانٹ کر اپنے ساتھ ملاتے چلے جائیں۔ اگر ان کی تعداد کافی ہو جائے جو میرے نزدیک جمہوری جدوجہد میں جمہوری اداروں کے اندر ایک تہائی ہے تو وہ ایک مضبوط نظریاتی گروہ کی حیثیت سے

قوت کے ساتھ اپنا مطلوبہ نظام نافذ کر سکیں گے۔ اگر جمہوری معاشرہ نہ ہو اور قوم کی ایک تہائی تعداد ان کے ساتھ مل جائے تو بھی وہ عوامی قوت سے نظام اسلامی کا اجرا کر لیں گے۔ لیکن اگر اتمام حجت کی حد تک کام کر لینے کے باوجود قوم سیدھے راستے پر نہ آئے اور اس قوم میں سے قابل ذکر تعداد صالحین کی برآمد نہ ہو اور مزید صالح افراد کا نکلنا بھی بند ہو جائے تو پھر بہتر ہے کہ ایسی قوم میں سے صالح افراد ہجرت کر جائیں۔ اس لیے کہ اب وہ قوم کوئلوں کا انبار ہے جو خدائی عذاب کی بھٹی سلگنے کے ساتھ ہی بھڑک اٹھے گا اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔ لیکن اگر ایسا مرحلہ نہیں ہے، بلکہ صالح افراد تیار ہو رہے ہیں، قوم کے اندر ابھی صالحیت اور نیکی کی قدر موجود ہے، اور تبلیغی کام کے نتیجہ خیز امکانات موجود ہیں، صالح افراد کی دریافت جاری ہے تو پھر اسلامی تحریک کو افرادی قوت میں مسلسل اور تدریجی اضافے کے لیے مسلسل صبر آزما کام کرنا ہوگا۔ جو شخص کچے پھل توڑتا ہے اس کے دامن میں تلخی اور نقصان کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ اسلامی تحریک کا جو کارکن اپنے حصے کا تبلیغی اور رابطۂ عوام کا صبر آزما کام کرنے سے جی چراتا ہے اور کردار سازی کی طرف توجہ دینے، تحریک کی دعوت پھیلانے، لوگوں کے اعتراضات اور سوالات کے جوابات دینے، اپنے قیمتی اوقات میں سے وقت نکالنے، اور اپنے آرام کو تج کر تبلیغی ریاضت برداشت کرنے سے جی چراتا ہے، لیکن صرف تشدد آمیز الفاظ، اشتعال انگیز نعرے اور جلسوں اور جلوسوں سے ہی کام نکالنا چاہتا ہے، وہ ابھی تحریک اسلامی کو نہیں سمجھا ہے اور اس کا باشعور کارکن بھی نہیں بن سکا ہے۔ اس کو دعوت دین کا کام سمجھایا اور سکھایا تو جا سکتا ہے لیکن اس کی تجویزیں اور تدبیریں تحریک کے لیے صحیح رہنمائی فراہم نہیں کر سکتیں۔

جو لوگ اسلامی تحریک کا کام کرنے کے لیے مردانہ وار آگے آئیں ان پر یہ بات تو واضح رہنی چاہیے کہ اسلامی تحریک کے ساتھ مالک کائنات کے خاص الخاص وعدے ہیں۔ البتہ پہلے ان وعدوں کا مصداق اور مستحق بننا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ (الانبیاء - ۱۰۵)
"ہم نے زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے۔"

اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران ۱۳۹)
"تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔"

مہربان مالک نے تو اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر بہت واضح انداز میں مومنین کے ساتھ ان الفاظ میں سورہ نور کے اندر مزید پختہ وعدہ کیا ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ (النور - ۵۵)

اللہ نے وعدہ فرمایا ہے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں کہ وہ ان کو اسی طرح زمین میں خلیفہ بنائے گا جس طرح ان سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کو بنا چکا ہے، اور ان کے لیے ان کے اس دین کو مضبوط بنیادوں پر قائم کر دے گا جسے اللہ نے ان کے حق میں پسند کیا ہے، اور ان کی (موجودہ) حالتِ خوف کو امن سے بدل دے گا۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ سب وعدے شعوری ایمان اور عمل صالح کے ساتھ مشروط ہیں اور ان شرائط کو کوئی نہیں بدل سکتا۔

ایمان اور حیاتِ اجتماعی[1]

از عبدالحمید صدیقی

فرد اور معاشرہ کے مابین تعلق کی نوعیت خاصی پیچیدہ ہے۔ اور کسی ایسی حدِ فاصل کا تعین آسان نہیں جو فرد اور معاشرہ کے حدود عمل کو واضح کر سکے اس لیے کہ جو چیز فرد پر اثر انداز ہوتی ہے وہی معاشرہ پر بھی اپنے اثرات مترتب کرتی ہے۔ اور پھر معاشرہ ہے کیا؟ افراد کے مجموعہ ہی کا تو نام ہے۔ افراد جن اعمال و اخلاق اور جس سیرت و کردار کے حامل ہوں گے معاشرہ میں بھی وہی روح جاری و ساری ہو گی۔ اس تعلق کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کرتے ہیں۔ دیوار، اینٹیں چن کر تعمیر کی جاتی ہے۔ اینٹیں اگر کچی ہوں گی تو دیواریں ناپختہ ہوں گی اور اگر اینٹیں پختہ ہوں اور انہیں ایک دوسرے سے پیوست کرنے والا مواد یعنی ریت اور سیمنٹ کی مناسب مقدار سے مرکب ہو تو دیوار بھی یقیناً پختہ ہو گی۔

پس ایک بنیانِ مرصوص کی تعمیر کا خواب اُس وقت تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا جب تک خوب مستحکم اور مضبوط اینٹیں موجود نہ ہوں۔ کسی معاشرے کی تعمیر میں افراد اینٹوں کا کام دیتے ہیں۔ گزشتہ مباحث میں ہم نے فرد کی زندگی پر ایمان کے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے جو کچھ بیان کیا ہے اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ معاشرہ کی اصلاح سے پہلے فرد کی اصلاح کا سامان کیا جائے۔ اب اس پر ہم اتنا اضافہ اور کریں گے کہ کوئی فرد اگر انفرادی طور پر سکونِ قلب، نعمتِ ایمان اور محبت و استقامت کے اوصاف سے متصف ہو بھی جائے تو سعادت کے مرتبۂ کمال سے محروم ہی رہتا ہے۔ یہ مقام بلند ایک فرد کو حقیقتاً اُسی وقت نصیب ہوتا ہے جب پورا اجتماعی ماحول نہ صرف ان صفات کے لیے سازگار ہو بلکہ انہیں پروان چڑھانے میں ممد و معاون ہو۔

ایک اچھے معاشرہ کی سب سے نمایاں خوبی افراد کا باہمی ربط و ضبط ہے۔ اسی کے ذریعے افراد کے

---

[1] یہ مضمون یوسف القرضاوی کی کتاب سے ماخوذ ہے۔

مابین محبت و یگانگت کے رشتے استوار ہوتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے دمساز بن کر رہتے ہیں۔ نہ کوئی کسی پر زیادتی کرتا ہے اور نہ سنگدلانہ برتاؤ۔ بہترین اور سعادتمند معاشرہ میں دولت سے بہرہ ور لوگ محروم طبقہ کو فراموش نہیں کرتے، ماثر درسوخ اور قدرت و طاقت کے مالک کمزوروں کو نظرانداز نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی معاونت اور دستگیری کرتے ہیں۔

بدترین چیز جو کسی معاشرہ کو لاحق ہوتی ہے وہ انتشار و تشتت اور باہمی روابط کا فقدان ہے۔ اور یہ صورت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب افراد خود غرضی میں مبتلا ہو جائیں۔ وہ اپنی ذات اور اپنے مفادات کو تو یاد رکھیں مگر اپنے بھائی کا مطلق خیال نہ کریں۔ بلکہ اُسے اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہ کریں۔ اسی طرح وہ وقت بھی کسی معاشرہ کے لیے بہت برا وقت ہوتا ہے جب افراد اپنے حقوق کے لیے لڑیں مگر اپنے فرائض سے غافل ہوں نیز اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھیں اور دوسری مخلوقِ خدا کو بنظرِ حقارت دیکھیں اس کے برعکس دوسری چیز جو اپنی قباحت میں متذکرۃ الصدر سے کسی طرح بھی کم نہیں یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کے احساس سے ہی یکسر محروم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو اسے شرف عطا کیا ہو، جو قوت و طاقت اُسے تفویض کی ہو اور جن انعامات سے اُسے نوازا ہو۔ وہ ان کا شعور و ادراک ہی نہ رکھتا ہو یا ان صلاحیتوں کو مہمل اور معطل کر کے بیٹھ جائے تو یہ چیز بھی انسان کی شخصیت کو نقصان پہنچاتی ہے اور انسان مستقل طور پہ کمزوری و دوں ہمتی کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اِس بات کی ہے کہ افرادِ معاشرہ کے مذکورہ بالا دونوں انتہا پسندانہ نظریات کے درمیان ایک ایسی حدِ وسط تلاش کی جائے تاکہ افراد اپنی ذات کا احساس بھی رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے حقوق و واجبات بھی تلف نہ ہوں۔ یعنی معاشرہ بھی مستحکم بنیادوں پر قائم رہے اور فرد کی شخصیت کی نشوونما بھی صحیح انداز سے ہو سکے۔

ایسی حدِ وسط کا تعین کچھ اصول و ضوابط کا مقتضی ہے جن کے بغیر تعلقات و معاملات میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا، جن کے بغیر انسانی جبلت عقل کے خلاف اور قوت و طاقت حق و صداقت کے خلاف اقدام کرنے سے باز نہیں رہ سکتی۔ اور جن کے بغیر ذاتی منفعت کا جنون اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر اپنی حدود سے تجاوز کر سکتا ہے۔ ایسے اصول و ضوابط یکسر اخلاقی بنیادیں رکھتے ہیں۔ ان کا مصدر و ماخذ انسان کا قلب و ضمیر ہوتا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم اس امر سے بحث کریں گے کہ معاشرے پر ایمان و اخلاق کے کیا اثرات مترتب

ہوتے ہیں۔ اور ایمان کے زیر اثر نشوونما پانے والے اخلاق کیونکہ انسان کو ایک ایسی بلند سطح تک پہنچا دیتے ہیں جہاں تک مادی اخلاق کے علمبرداروں کی رسائی کسی طرح بھی ممکن نہیں۔

ایمان اور اخلاق

کیا طبیعت و جبلت اجتماعی زندگی کی رہنمائی کے لیے کافی ہے؟ | جب ہم حیوانات کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی انفرادی و اجتماعی دونوں قسم کی زندگی کے لیے محض جبلی رہنمائی کافی ہے۔ چیونٹیوں یا شہد کی مکھیوں کو دیکھئے۔ کتنے حیرت انگیز طریقے سے یہ حشرات اپنا رزق حاصل کرتے ہیں اور آنے والے وقت کے لیے اس کے مناسب ذخیرہ کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ ان کا ہر فرد ایک نظم کا پابند ہوتا ہے اور اپنا اپنا فرض ——— دوسرے افراد کے فرائض میں رکاوٹ پیدا کیے بغیر ——— بجا لاتا ہے۔ یہی حال دوسرے جانوروں کا بھی ہے۔ پرندوں کے اڑتے ہوئے غول، ڈھور ڈنگروں اور مویشیوں کے ریوڑ، جنگلات میں درندوں کی منظم زندگی اور سمندروں کی تہوں میں مچھلیوں اور دوسری بے شمار انواع حیوانات کی یکجائی ——— اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ حیوانات کا اجتماع ان کی فطری و جبلی رہنمائی کے تابع ہوتا ہے۔

لیکن انسانوں کا معاملہ ان سے یکسر مختلف ہے۔ جبلت کے اعتبار سے حیات انسانی اپنے اندر متعدد پہلو رکھتی ہے۔ ایک فرد کی حیثیت سے اس کے اندر جذبہ انانیت موجزن ہوتا ہے جو اسے اپنی ذات سے غیر معمولی محبت پر ابھارتا ہے مگر اسی جبلت کا دوسرا مظہر یہ بھی ہے کہ وہ بنی نوع انسان سے کٹ کر زندہ رہنا گوارا نہیں کرتا۔ ابنائے جنس کے درمیان رہ کر وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو نشوونما دیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ دوسرے انسانوں کے لیے بڑے سے بڑا ایثار کرنے پر بھی تیار ہو جاتا ہے۔

برطانوی فلسفی برٹرنڈرسل نے کہا ہے "انسان کے جذبات و خواہشات کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ اور اسی پیچیدگی سے نت نئی مشکلات پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی زندگی نہ تو صرف اجتماعی رنگ لیے ہوئے ہے جیسے چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کی زندگی اور نہ صرف انفرادی رنگ جیسے شیر ببر اور چیتے کی زندگی۔ اس کی حیات کا کچھ حصہ اجتماعیت آشنا ہے جبکہ کچھ حصہ انفرادیت پسندانہ۔ اس کی طبیعت میں حیاتِ اجتماعیہ

کی طرف میلان کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ خلوت و تنہائی کو بسا اوقات انسان ایک شدید عقوبت خیال کرتا ہے۔ دوسری طرف زندگی کا انفرادی رنگ بھی اسے محبوب ہوتا ہے جب بعض خاص امور و مفادات اس کے داعی ہوں۔ بنا بریں ہمیں کچھ اخلاقی حدود و قیود وضع کرنے ہوں گے تاکہ تصرف و اختیار کے دوائر متعین ہو سکیں۔"

آپ کا کیا خیال ہے اخلاق کے وہ صحیح حدود و قیود اور قواعد و ضوابط کون وضع کر سکتا ہے؟ اور کیا چیز ٹھیک ٹھیک ان کے مطابق حیاتِ انسانی کی گاڑی کو چلا سکتی ہے! کیا یہ کام قانون کر سکتا ہے؟ یا کوئی فلسفۂ اخلاق؟ یا پھر دین و ایمان؟ ہم کوشش کرتے ہیں کہ ان تینوں کی حقیقت پر کچھ روشنی ڈالیں۔

تنہا قانون انسانی زندگی کو منضبط نہیں کر سکتا | اس میں کچھ شک نہیں کہ قانون ایک طاقت ہے اور اجتماعی زندگی کا نظام چلانے کے لیے ناگزیر ہے۔ لیکن انسانی زندگی پر پوری طرح یہ اس لیے حاوی نہیں کہ اس کا تعلق صرف ظاہر سے ہوتا ہے باطن سے نہیں۔ نیز یہ امورِ عامہ سے بحث کرتا ہے اور خاص حالات کا اس میں لحاظ نہیں رکھا جاتا۔ پھر قانون میں یہ سقم بھی ہے کہ وہ مجرم کو سزا دیتا ہے مگر محسن اور نکوکار کے صلہ کا کوئی اہتمام نہیں کرتا۔ علاوہ ازیں قانون کی گرفت سے لوگ حیلے بہانے کے ذریعے بچ بھی جاتے ہیں۔ اور قانون میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ مجرمانہ ذہنیت کا کماحقہٗ تعاقب کر سکے۔ پس جب جرم کے سدِ باب میں قانون عاجز سا نظر آتا ہے تو عملِ صالح اور امورِ خیر و فلاح کی ترغیب میں تو اس کا عجز اور بھی نمایاں ہونا چاہیے۔

قانون میں عدل و انصاف اور حق و صداقت سے زیادہ سے زیادہ مطابقت پیدا کرنے کے باوجود اس میں ایسی کوئی ذاتی قدرت پیدا نہیں ہوتی جو لوگوں سے اس کی پابندی کرا سکے الا یہ کہ حکومت کی طاقت اس کے پیچھے ہو۔ اور جہاں تک حکومت کی طاقت کا سوال ہے اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ یہ ہر حال میں ظلم کے استیصال اور عدل کے فروغ دینے کے لیے ہی کوشاں رہے گی۔ کیونکہ اربابِ حکومت بھی انسان ہی ہوتے ہیں جنہیں نشۂ حکمرانی اکثر و بیشتر راہِ راست سے بھٹکا دیتا ہے۔ چنانچہ جب وہ قانون سازی کرتے ہیں تو اپنے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں اور اپنے خیالات و نظریات کو اس میں سمونے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ معلوم ہے کہ کوئی انسان بھی اس قابل نہیں ہوتا کہ زندگی کے جملہ پہلوؤں پر اس کی نظر پوری جامعیت کے ساتھ پڑتی ہو۔ اس کے خیالات و نظریات تمام تر صحیح اور حقائق پر مبنی ہوں اور اپنی خواہشات و مفادات

سے بے تعلق رہتے ہوئے وہ کلیۃً غیر جانبداری کے ساتھ قانون وضع کر سکے۔ پس جو قانون یہ بنیادی کمزوریاں اپنے اندر رکھتا ہو کون انسان اور کونسا معاشرہ اُس پر مطمئن ہو سکتا ہے اور اپنی پوری زندگی کو اُس کے تسلط میں دینے کے لیے تیار بھی۔

فلسفۂ اخلاق بھی کافی نہیں | یہی حال فلسفۂ اخلاق کا بھی ہے۔ کوئی اخلاقی فلسفہ معدودے چند افراد کو تو اپنی طرف مائل کر سکتا ہے پورے معاشرے کی توجہ اپنی طرف مبذول نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر فلسفی کا اپنا فلسفۂ اخلاق ہوتا ہے اب لوگ کس کی پیروی کریں۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان میں سے کسی فلسفہ کے پیرو کی جزا کیا ہے؟ کیا عقل و دل اسی پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ یا وہ محض ایک سراب ہے جسے پانی سمجھ کر پیاسا اس کی طرف لپکتا ہے۔ اُس نامعلوم سپاہی کی کیا جزاء ہے جو سب کی خدمت کے لیے کام کرتا ہے حالانکہ اُسے نہ کوئی دیکھتا ہے نہ جانتا ہے اور اسے بدلہ دینے کی کسی کو فکر نہیں! اپنی قوم اور اپنے خاندان کے لیے جان کی قربانی پیش کرنے والے کی کیا جزا ہے جو ان کا دفاع کرتے ہوئے لڑتا اور مظلومیت کی موت مرتا ہے۔ یہاں جس راحتِ ضمیر کا فلسفہ اخلاق کے علمبردار ذکر کرتے ہیں۔ اس کا کوئی وجود بھی ہے؟ دوسری طرف ساری عمر ظلم و ستم روا رکھنے والے کی سزا کیا ہے؟ اور وہ جو دل کی معمولی کھٹک کے بغیر من مانیاں کرتا ہے اس کے لیے اس بے قید اور بے لگام زندگی یہ کوئی تعزیر بھی ہے؟

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں جس چیز کو مسترد کیا ہے وہ فلسفیوں کے تصوراتِ اخلاق ہیں۔ لیکن جہاں تک دین و مذہب کے بیان کردہ محاسنِ اخلاق کا تعلق ہے اُن کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ وہ ترقی یافتہ فرد کی بنیاد اور مہذب معاشرے کی جان ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر زندگی، زندگی نہیں رہتی قرآن میں نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی زیادہ سے زیادہ جو تعریف کی گئی ہے اس کی بنیاد یہی اخلاق ہے وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اور خود رسولِ پاک نے اپنے پیغامِ ہدایت کو چند الفاظ میں یوں سمویا ہے:

اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ — میرا مقصدِ بعثت یہ ہے کہ مکارمِ اخلاق کی تکمیل کر دوں۔

ایک اور حدیث نبوی میں ہے:

اَكْمَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ اِيْمَانًا اَحْسَنُهُمْ خُلُقًا۔ — اہل ایمان میں سب سے زیادہ مکمل ایمان اُس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔

ان آیات و احادیث سے دین میں اخلاق کی اہمیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

دین، اخلاق کی طرف محض دعوت دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ اخلاق کی بنیاد پر اصول و ضوابط وضع کرتا ہے۔ حدودِ اخلاق کی نشاندہی کرتا ہے۔ زندگی کی جزئیات تک کے لیے اخلاقی نمونوں کے انبار لگا دیتا ہے اور ان پر مستقل مزاجی کے ساتھ قائم رہنے کی زوردار تلقین کرتا ہے۔ اسے اصولِ اخلاق سے انحراف قطعاً گوارا نہیں ہوتا۔ وہ واضح طور پر بتاتا ہے کہ انحراف کرو گے تو دنیا و آخرت میں یہ سزا ملے گی اور اصولِ اخلاق کی پاسداری پر دونوں جہانوں میں یہ بہترین صلے ملیں گے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ دین کے بغیر تکمیلِ اخلاق ممکن نہیں اور اخلاق کے بغیر کسی قانون کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

عقیدہ و ایمان معاشرتی و اجتماعی زندگی کے لیے جن اصولِ اخلاق کی ضرورت ہوتی ہے گذشتہ سطور میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ وہ نہ تو انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں ملتے ہیں اور نہ فلاسفہ کی پُرپیچ بحثیں اُن تک رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کا سراغ اگر کہیں ملتا ہے تو دامنِ ایمان میں ملتا ہے۔ ایمان اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ حیاتِ دنیا کا مقصود خواہشاتِ نفس کی تکمیل نہیں۔ نہ شکم پروری اور لذتِ کام و دہن کا اصول انسانی زندگی کی غایت ہے۔ کسی قسم کے تعصب کو بھی وہ انسان کا نصب العین نہیں بننے دیتا اور مکر و فریب اور فتنہ و فساد کی آلائشوں سے بھی انسانی زندگی کو پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ ایمان جو مقصدِ حیات انسان کے سامنے رکھتا ہے وہ نہایت ارفع و اعلیٰ مقصد ہے یعنی اللہ سے قریب ہونا اُس کے ضابطوں کی پابندی کرنا اور اس کی خوشنودی کے لیے تگ و دو کرنا۔ اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں:[۱]

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ

لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس —— عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ ان

---

[۱] سورۂ آلِ عمران ۳: ۱۴، ۱۵

مِنۡ ذٰلِکُمۡ ؕ لِلَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا عِنۡدَ رَبِّہِمۡ
جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ
خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا وَ اَزۡوَاجٌ مُّطَہَّرَۃٌ وَّ
رِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ ۚ
اَلَّذِیۡنَ یَقُوۡلُوۡنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ اٰمَنَّا
فَاغۡفِرۡ لَنَا ذُنُوۡبَنَا وَ قِنَا عَذَابَ
النَّارِ ۚ اَلصّٰبِرِیۡنَ وَ الصّٰدِقِیۡنَ وَ
الۡقٰنِتِیۡنَ وَ الۡمُنۡفِقِیۡنَ وَ الۡمُسۡتَغۡفِرِیۡنَ
بِالۡاَسۡحَارِ ۝

سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے۔ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے اللہ اپنے بندوں کے رویے پہ گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں: مالک ہم ایمان لائے ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتشِ دوزخ سے بچالے۔ یہ لوگ صبر کرنے والے ہیں۔ راستباز ہیں فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔

آیت پاک میں جن اوصاف کی نشاندہی کی گئی ہے وہ دراصل ثمرات ہیں اُس اخلاق کے جو ایمان کے زیرِ اثر نشوونما پاتا ہے۔ اور جس سے مسلم معاشرہ کا ہر فرد متصف ہوتا ہے۔ پس محاسنِ اخلاق سے ہر فرد کا مزین ہونا گویا بہترین معاشرہ کی بنیادوں کا مضبوط و مستحکم ہونا ہے۔

اخلاقِ الٰہی کو اپنے اندر پیدا کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مقامِ الوہیت پہ فائز ہو سکے۔ یہ چیز نہ مطلوب ہے نہ ممکن۔ مقصود صرف یہ ہے کہ انسان حیوانیت کی سطح سے بلند ہو جائے اور حضرتِ حق کے مبدأ فیض سے اخذ و استفادہ کی مسلسل کوشش کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ علیم و حکیم ہیں انسان کو بھی چاہیے کہ علم و حکمت کے موتیوں سے اپنے دامن کو بھرنے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم ہیں انسان بھی اپنے اندر جذبۂ رأفت و رحمت پیدا کرے۔ اللہ تعالیٰ غنی و کریم ہیں انسان بھی اپنی طاقت کے مطابق غنیٰ و کرم کے اوصاف سے متصف ہو۔ اللہ صبور و حلیم ہیں انسان بھی مقدور بھر حلم و صبر سے کام لے۔ اللہ تعالیٰ جبار و متکبر ہیں انسان بھی طاغوتی طاقتوں کے مقابلے میں کمزور نہ ہو، پست ہمت ثابت نہ ہو اور دنی الاخلاق اور

بداعمال قسم کے لوگوں سے مرعوب و متاثر نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ وہ بڑا زبردست اور انتہائی سخت گیر ہے۔ انسان کو بھی چاہیے کہ وہ کفار و مشرکین کے لیے بڑا شدید اور مفسدین کی راہ روکنے والا ہو۔ اللہ تعالیٰ شکر کی قدر کرنے والے اور خطا کاروں کو معاف فرمانے والے ہیں انسان کا بھی کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ حسن سلوک کرنے والوں کا قدرداں ہو اور معذرت چاہنے والوں سے درگزر کرے۔ اللہ تعالیٰ کبھی راہِ راست سے انحراف نہیں فرماتے انسان کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمیشہ جادہ مستقیم پر گامزن رہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہر صفت شانِ کمال رکھتی ہے۔ اور وہ ذات ہر عیب سے پاک اور ہر نقص سے منزہ ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو نقائص اور عیوب سے پاک کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

اب فرمائیے کہ جس معاشرے کے افراد کے سامنے یہ اخلاقِ الٰہی ہوں کیا اُن کے اندر کوئی خرابی یا بگاڑ رونما ہو سکتا ہے۔ اور کیا ان کی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا بھی ہو سکتا ہے جو نورِ حق سے منور نہ ہو۔ اور نفوس و طبائع انسانی کے لیے اخلاق اللہ سے زیادہ موثر کوئی اور چیز بھی ہے جس کی تاثیر کی انہیں حاجت ہو اور جس کے لیے انہیں دائرہ دین و ایمان سے باہر قدم رکھنا پڑے؟ ظاہر ہے کہ ایسی کسی چیز کا انفس و آفاق میں کہیں وجود نہیں۔

(بقیہ اشارات)

انہیں ایک قوم بنایا ہے وہ رشتہ معطل اور کمزور ہو جائے اور اس کی جگہ نسلی اور لسانی تعصبات کو سر اٹھانے کا موقع ملے اور اس طرح اس قوم کا شیرازہ بالکل منتشر ہو کر رہ جائے اور غیر ملکی طاقتیں ان چھوٹی چھوٹی قومیتوں کو بڑی آسانی سے ہڑپ کر سکیں۔ سقوط ڈھاکہ کے موقع پر اندرا گاندھی اور اس کے ہمنوا بہت سے دوسرے مغربی مفکرین اور سیاستدانوں نے جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا تھا وہ الفاظ کے تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ قریب قریب یہی تھے کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ دورِ جدید میں مذہب کی اساس پر کسی ملک کا قیام خیال خام ہے۔

پاکستان میں اسلام کے خلاف سازش کی دوسری کمین گاہ غیر اسلامی ادب اور ثقافت ہے۔ اشتراکی خیالات رکھنے والے ادیبوں نے عوام کے ذہنوں کے اندر انتشار پیدا کرنے اور انہیں دائرہ اسلام سے نکال کر مارکس اور لینن کا حلقہ بگوش بنانے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ شعائر اسلام کا مذاق اُڑایا، علماء کی

تضحیک کا سامان فراہم کیا اور اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ یہ دین محض قصہ پارینہ ہے اور اس کی تعلیمات ماضی کی داستانیں ہیں جنہیں رہوارِ زمانہ نے گرد کی طرح پیچھے پھینک دیا ہے۔ چنانچہ جو لوگ نئے زمانے میں پرانی باتیں سنانے کا شغل فرمارہے ہیں وہ کوئی تاریخ ساز اور انسانیت کے خیرخواہ لوگ نہیں بلکہ احمق اور دشمنِ انسان ہیں کیونکہ انسانیت نے جن زنجیروں کو توڑ دیا ہے، اور جن جنگلوں کو خیرباد کہہ دیا ہے اُن کی طرف بلانے والوں کی آواز ہمیشہ وحشت اور دیوانگی کی آواز ہوتی ہے۔

فکری انتشار کے علاوہ ادیبوں کے اس گروہ نے نوجوان نسل کے اخلاق کو بگاڑنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ سارا کام انہوں نے اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر کیا کہ بگڑے ہوئے اخلاق کے لوگ ممکن ہے کسی دوسری تحریک یا کسی دوسرے نظامِ حیات کے لیے کارآمد ثابت ہوں مگر اسلام کے لیے بالکل بیکار ہوتے ہیں اس لیے اگر نوجوانوں کے اخلاق تباہ کرنے میں وہ کامیاب ہو جائیں تو پھر یہاں اسلامی نظامِ حیات کے احیاء کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔

سیاسی میدان میں اس سازش نے یوں تو مختلف مورچے قائم کر رکھے ہیں مگر اس کا سب سے زبردست مورچہ وہ ہے جہاں سے دینی جماعتوں اور خصوصاً جماعت اسلامی پر ہر وقت گولہ بارود پھینکا جاتا ہے۔ لیاقت علی خاں سے لے کر صدر بھٹو تک یہاں جتنے لوگ بھی برسرِاقتدار آئے سب نے اقتدار کی قوت کو بے تحاشا جماعت اسلامی کے خلاف استعمال کیا نشرواشاعت کے ذرائع اسے عوام میں رسوا اور بدنام کرنے کے لیے کام میں لائے گئے، اس کے ہمدردوں اور ارکان کو ملازمتوں اور رزق کے دوسرے وسائل سے محروم کیا گیا اور اس کے کارکنوں کو متعدد بار جیلوں میں ٹھونسا گیا تاکہ یہ لوگ اپنے مقدس مشن سے دستکش ہو جائیں اور اسلام کی کوئی ایسی صورت گوارا کر لیں جس سے دینِ حق کا اجتماعی معاملات میں کوئی عمل دخل باقی نہ رہے اور اللہ کا دین مسیحیت کی طرح انسان اور خالق کے درمیان ایک ذاتی تعلق بن کر رہ جائے۔

دوسری طرف اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا کہ ملک میں آمریت کا دور دورہ رہے تاکہ ایک شخص یا ایک محدود سا گروہ عوامی احساسات سے بے نیاز ہو کر جماعت اسلامی اور دوسری خادمِ دین جماعتوں پر جس طرح چاہے مشقِ ناز کرتا رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن

ہمارے درج ذیل ایجنٹ حضرات سے دستیاب ہوسکتی ہے

۱- اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکٹ لاہور
۲- فیروز سنز لمیٹڈ، دی مال، لاہور
۳- مکتبہ تنویر القرآن اُردو بازار لاہور
۴- نورسی پبلیکیشنز، لیاقت آباد کراچی
۵- مکتبہ تعمیر افکار اسلامی بالائی منزل حسین ڈیکوریشن ناظم آباد کراچی
۶- شیخ سنز، اُردو منزل، اُردو بازار کراچی
۷- کراچی بک ڈپو ۸۴ اُردو بازار کراچی
۸- اقبال بک ڈپو سمرسٹ سٹریٹ صدر کراچی
۹- مسعود علی رضوی رضوان آباد فیڈرل بی ایریا منصورہ کراچی ۳۸
۱۰- اتحاد بک ڈپو، گاڑی کھاتا حیدر آباد
۱۱- مکتبہ اسلامی، کورٹ روڈ حیدر آباد
۱۲- رحمان نیوز ایجنسی، شارع فاطمہ جناح کوئٹہ
۱۳- گوشۂ ادب سرکلر روڈ کوئٹہ
۱۴- مکتبہ اسلامی معرفت دفتر جماعت اسلامی جیکب آباد
۱۵- مصاحب علی صاحب امیر جماعت اسلامی نواب شاہ
۱۶- عجائب سٹورز (رجسٹرڈ) فریر روڈ سکھر۔
۱۷- مکتبہ تعمیر ملت ڈہرکی ضلع سکھر۔
۱۸- ملت بک ڈپو ریلوے روڈ رحیم یار خاں
۱۹- عزیز اینڈ سنز شاہی بازار لاڑکانہ
۲۰- امداد علی قادری مکتبہ اسلامی قنبر علی خاں
۲۱- مکتبۂ احیائے ملت کپ بازار ملتان
۲۲- ضیا بک ڈپو، چمن بازار ہارون آباد
۲۳- قاری محمد عبداللہ صاحب مسجد گول چوک اوکاڑہ
۲۴- اللہ دین سلیم امیر جماعت اسلامی، لائل پور
۲۵- حاجی دین محمد صاحب ماموں کانجن
۲۶- ادارۂ امتیاز کمالیہ
۲۷- خان زمان خان اینڈ کو، غلہ منڈی سرگودھا۔
۲۸- چوہدری راجولی صاحب مشین محلہ جہلم۔
۲۹- مولوی غلام رسول صاحب منڈی بہاءالدین
۳۰- مکتبہ افکار اسلامی ۸۴ بازار تلواڑاں راولپنڈی۔
۳۱- مکتبہ اسلامیہ منڈی بازار لالہ موسیٰ
۳۲- عبدالعزیز دوکان ۵ ۱-۱۲ ایریا مارکیٹ واہ کینٹ
۳۳- شیخ سعید احمد خاکسار مارکیٹ فاروق جنرل سٹور ڈی جی خان
۳۴- خواجہ محمد یونس کندھکوٹ
۳۵- حکیم محمد اسحاق حویلیاں (۳۶) فیض محمد ہری پور ہزارہ
۳۷- شوکت کریانہ سٹور، مانسہرہ
۳۸- مکتبہ اسلامی، بنک روڈ، مردان
۳۹- عزیزیہ کتب خانہ چوک صرافہ بازار ڈیرہ اسمٰعیل خان
۴۰- عبدالرحمٰن شاہ خطیب جامع مسجد غزنی خیلان بنوں شہر
۴۱- ضیاء بک ڈپو بنور روڈ منگورہ
۴۲- میاں محمد شفیع صاحب آڑھت مرچنٹ جناح چوک میاں چنوں
۴۳- حاجی محمد اسمٰعیل مکتبہ اسلامی برتن منڈی میرپور خاص
۴۴- یونائیٹڈ بکسیلرز اینڈ سٹیشنرز اُردو بازار کراچی
۴۵- سردار محمد اشرف خاں صاحب- آزاد کشمیر کلاتھ اینڈ جنرل سٹور بالمقابل ہائی سکول غازی۔
۴۶- پاک نیوز ایجنسی سٹیشنرز اینڈ بکسیلرز تربت ضلع مکران